ڈائرکٹوریٹ آف ڈِسٹینس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموّں، جموّں

کلاس: ایم۔اے　　مضمون : اُردو

کورس نمبر: 105 (جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کا ارتقاء)　　سمسٹر: اول

یونٹ: I-IV　　اکائیاں: 1-16

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

کورس کوآرڈی نیٹر، ایم۔اے۔اردو، ڈی۔ڈی۔ای

صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو

ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر (c) شائع نہ کیا جائے۔

زیر انتظام نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

اڈیٹینگ : ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو، ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

SYLLABUS FOR NON-CBCS

Examination to be held in December 2019,2020 and 2021

TITLE OF THE COURSE: DEVELOPMENT OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE IN JAMMU AND KASHMIR

CREDITS: 4 MAXIMUM MARKS: 100

A. SEMESTER EXAM: 80

B. INTERNAL ASSESSMENT: 20

Objectives:-

The purpose of this Course is to acquaint the students with the development of Urdu language and literature in the J&K State. An effort shall be made to make the students conversant with the various socio-cultural imperatives which led to the development of Urdu language in the state.

Unit-I: Socio-Cultural Study

1۔ جموں وکشمیر کا تہذیبی ولسانیاتی پس منظر

2۔ جموں وکشمیر میں اُردو زبان کے ابتدائی نقوش

3۔ جموں وکشمیر کے صوفیا اکرام اور اردو زبان

4۔ جموں وکشمیر کی مقامی زبانوں اور اردو کا رشتہ (کشمیری، پہاڑی، گوجری اور ڈوگری)

Unit-II: The Study of Dogra Rule:

1۔ اُردو زبان وادب: مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں (1846-1857)

2۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد اور اُردو زبان وادب (1857-1885)

3۔ اُردو زبان وادب کے فروغ میں بدیا بلاس سبھا اور بدیا بلاس اخبار کی خدمات

Unit-III: The Study of Dogra Rule:

1۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا عہد اور اُردو زبان

2۔ جموں وکشمیر کی سرکاری زبان اردو کا تاریخی ارتقاء

3۔ اُردو جموں وکشمیر کی درباری وسرکاری زبان

4۔ آزادی سے قبل غیر سرکاری اداروں کی خدمات

Unit-IV: Study of regional Urdu Literature

1۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کا آغاز وارتقاء

2۔ جموں وکشمیر کے نامور اُردو شعراء (رسا جاودانی، میر غلام رسول نازکی، حکیم منظور، عرش صہبائی)

3۔ جموں وکشمیر میں اُردو افسانوی ادب (ناول اور افسانہ)

4۔ جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب (انشائیہ، سفرنامہ، خاکہ، خودنوشت)

5۔ جموں وکشمیر میں اُردو کے فروغ میں دُوردرشن، یونیورسٹی کے اُردو شعبوں، کلچرل اکیڈمی اور مختلف انجمنوں کی خدمات

NOTE FOR PAPER SETTER:-

There are four units in the course No: URD-105

this Paper shall be devided in four Units viz Unit-I, Unit-II, Unit-III and Unit-IV.

The paper setter shall be set two question from each Unit, the candidates shall be required to attempt one question from each Unit. The total number of questions to be attemted in this Paper shall be 4, which will carry equal marks. Unit wise distribution of marks shall be as Unit-I = 20, Unit-II = 20, Unit-III = 20, Unit-IV=20. Total is 80. Distribution of Internal Assessments shall be two home assignments = 10x2 =20.

Books Recommended:

1. Kashmir Mein Urdu, by Abdul Qadir Sarwari.

2. Riyasat Jammu-O-Kahsmir mein Urdu Zaban-o-Adab ki Nashunuma, by Dr.Brij Premi.

3. Riyasat Jammu-O-Kahsmir mein Urdu Mazi,HaalaurMustaqbil, by Prof.Shohab Inayat Malik.

4. Jammu-O-Kahsmir mein Urdu Adab, by Prof. Hamidi Kashmiri.

5. Reyasat Mein Urdu Sahafat, by Sofi Mohi-ud-Din.

6. Ajkal Kashmir number by Delhi.

7. Mahnama "Tamir" Jammu-o-Kashmir Mein Urdu Adab, Number.

8. Jammu wa Kashmir mein Urdu Adab: 2000 se 2013 Tak, by Liaqat Ali.

فہرست

1	جموں وکشمیر کا تہذیبی ولسانیاتی پس منظر	02
2	جموں وکشمیر میں اُردو زبان کے ابتدائی نقوش	08
3	جموں وکشمیر کے صوفیا اکرام اور اردو زبان	13
4	جموں وکشمیر کی مقامی زبانوں اور اردو کا رشتہ (کشمیری، پہاڑی، گوجری اور ڈوگری)	18
5	اردو زبان وادب مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں	26
6	مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد اور اردو زبان	29
7	جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ میں بدیا بلاس سبھا اور بدیا بلاس اخبار کی خدمات	33
8	مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا عہد اور اُردو زبان	38
9	جموں وکشمیر کی سرکاری زبان اردو کا تاریخی ارتقاء	44
10	اُردو جموں وکشمیر کی درباری وسرکاری زبان	50
11	آزادی سے قبل غیر سرکاری اداروں کی خدمات	54
12	ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کا آغاز وارتقاء	58
13	جموں وکشمیر کے نامور اُردو شعراء (رسا جاودانی، میر غلام رسول نازکی، حکیم منظور، عرش صہبائی)	83
14	جموں وکشمیر میں اُردو افسانوی ادب (ناول اور افسانہ)	92
15	جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب (انشائیہ، سفر نامہ، خاکہ، خودنوشت)	124
16	جموں وکشمیر میں اُردو کے فروغ میں دُوردرشن، یونیورسٹی کے اُردو شعبوں، کلچرل اکیڈمی اور مختلف انجمنوں کی خدمات	
	اسائنمنٹ سوالات	133

اکائی نمبر 1: جموں وکشمیر کا تہذیبی ولسانیاتی پس منظر

ریاست جموں وکشمیر کا برصغیر کی دیگر ریاستوں کے ساتھ تہذیبی اورلسانی رشتہ بہت ہی قدیم زمانے سے رہا ہے۔ جو بہت دِل چسپ بھی ہے اور رنگین بھی، اس لیے شمالی ہندوستان کی دوسری بہت ساری ریاستوں کی طرح اس ریاست میں بھی زیادہ تر آرین خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ ایک ہی محنتی، حسین اور ذہین نسل سے تعلق رکھنے کے سبب ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ اور اُتر پردیش کے لوگوں کی زبانیں بھی ہندایرانی زبانوں کی کسی نہ کسی شاخ سے رشتہ رکھتی ہیں جو ان تمام ریاستوں میں پھیلے ہوئے قدیم آریوں کے اُس مشترکہ گھر اور تہذیب کی یاد تازہ کرتی ہیں جسے قدیم تاریخوں اور تذکروں میں ''ایرانویج'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''ایرانویج'' سے نکل کر افغانستان کے ''ہندوکش'' پہاڑی سلسلوں سے ہوتے ہوئے آریوں کا کون سا خاندان کب پنجاب میں آکر آباد ہوا اور کب کشمیر میں۔ اس حوالے سے قطعیت کے ساتھ کچھ کلام کرنا مشکل ہے۔ مشہور یورپی محقق سر جارج گریرسن نے اپنی تصنیف ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' (Liguistic Survey of India) میں کشمیری، اُردو، ہندی، پنجابی اور بنگالی وغیرہ کو شورسینی اوراپ بھرنش کی بیٹاں چتایا ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق ان زبانوں کا تعلق ہندآریائی زبانوں کے گروہ کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر چٹرجی اور ڈاکٹر سدھیشور ورما جیسے محققین بھی اس حوالے سے گریرسن کی ہی تائید کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ جمیل جالبی نے بھی اپنی مشہور کتاب ''تاریخ ادب اُردو'' میں گریرسن کی تائید کی ہے۔ اس لسانی تعلق پر بعد کے تجارتی اور تہذیبی اثرات کیا پڑے اس پر بحث چھیڑنے سے پہلے یہ امر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شمالی علاقوں کی مشترکہ تہذیبی میراث اور ماقبل تاریخ رشتوں پر جو روشنی چار ویدوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے، اُس کو برصغیر ہند کی پہلی قابلِ قدر تاریخی دستاویز ''راج ترنگنی'' مزید واضح کرتی ہے۔

کشمیری نژاد کلہن پنڈت کی یہ تصنیف ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے باشندوں اور قدیم کشمیریوں کی مِلی

جُلی تہذیب اور مشترکہ عقائد واوہام کے علاوہ کشمیریوں کی عادات ورسومات کا بھی مفصل بیان کرتی ہے۔اس اعتبار سے اس تاریخی کتاب کی اہمیت وافادیت کشمیر کی قدیم ترین دستیاب تحریر ''نیل مت پوران'' سے بھی دوچند ہوجاتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ راج ترنگنی کی عبارت تاریخی نثر سے ہٹ کر سنسکرت شاعری کے اُن مشہور نمونوں میں شامل کی جاتی ہے جن کو اُس دور کے ذہین ترین کشمیریوں کی دین سمجھا جاتا ہے۔ جب سارے ہندوستان میں سنسکرت کا طوطی بول رہا تھا۔اعلیٰ پایہ کا سنسکرت لٹریچر نصف سے زیادہ حصہ صرف کشمیر میں تیار کیا گیا۔اس تاریخی وتحقیقی کام میں آنندوردھن، ابھنوگپت اور ممٹ کے کارنامے آج بھی پوری دُنیا میں عزت کی نگاہوں سے صرف دیکھے ہی نہیں جاتے بلکہ سراہے بھی جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنندوردھن کی تصنیف دھونیہ لوک سے دُنیا بھر کے اہم ماہرین لسانیات نے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔اُس عہد میں کشمیر کو علم کا ایک عظیم مرکز مان کر ''شاردا پیٹھ'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ ''شاردا پیٹھ'' کہلانے سے کئی صدیاں پہلے بھی کشمیر کو بُدھ دھرم کی تعلیمات واشاعت کا ایک بڑا مرکز ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔اس وقت مہاراجہ اشوک اعظم کا عہد دِل پذیر تھا۔اس اعزاز کی اہمیت مہاراجہ کنشک کے زمانے میں اور بھی بڑھ گئی جب چوتھی صدی عیسوی میں عالمی سطح کی چوتھی کانفرنس کشمیر میں منعقد کی گئی۔اس کانفرنس میں پڑوسی ممالک سے آنے والے بودھ عالموں کے ساتھ دیگر لوگوں کے علاوہ فاہیان جیسے چینی سیاح بھی شامل ہوئے تھے۔ مہاتما بدھ کے اہنسا پر مبنی عدم تشدد کے نظریہ پر مشتمل تعلیمات کا مرکز بن جانے کے بعد کشمیر کے کتنے بُدھ بھکشوں اور ہمسایہ ریاستوں سے آکر اُن کے ساتھ شامل ہوجانے والے کتنے بُدھ پرچارک چین، جاپانا، افغانستان، ترکستان، جاوا اور سماٹرا جیسے دور اور نزدیک علاقوں میں جاتے رہے ہیں۔ان کا کام تھا کہ وہ ان علاقوں میں جاکر ہسپتال کھولتے تھے اور رفاہ عام کے دیگر کاموں سے ہزاروں انسانوں کے دِل کسی طرح جیت لیتے تھے۔اس حوالے سے کئی تحقیقی مقالے رقم ہوئے ہیں۔ان مقالوں میں اور بحثوں کے علاوہ قدیم ہندوستان کے پرانے کول اور دراوڑ نام کے باشندوں کی مانند اُن قدیم کشمیری خاندانوں کی تہذیب اور رہن سہن پر بھی بہت سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔جن

کوایران کے نقشِ رُستم کے ساتھ بڑی حدتک مِلتے جُلتے آثارِقدیمہ کے ناطے بُرزہامہ اور ہاپتھ نار میں پائے گئے ۔ آثارکوترک کرنے والا سمجھ کرناگ اور یشاچ جیسے قدیم ناموں سے یادکیا گیا ہے اورانہیں کشمیر کے اصلی باشندے سمجھا گیاہے۔ سانپوکی پوجا کرنے اور کچا گوشت کھانے والے ناگوں اور پشاچوں کے ساتھ آسام جیسے علاقوں کے باشندے کتناقدیم اور گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بالخصوص اس لحاظ سے کہ بُدھ مت اورشومت سے گذر کربھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے موقعے پر ہی مچھلی اور گوشت کثرت سے نہیں کھاتے بلکہ عام دنوں میں بھی انڈا، گوشت ،مچھلی اورمُرغ کھاتے رہتے ہیں۔

لگ بھگ دسویں صدی عیسوی کے بعد جب ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے تہذیبی وثقافتی اورتجارتی تعلقات مسلمانوں کی زیرحکومت عرب، ایران اورترکستان کے بعض علاقوں کے ساتھ بہت بڑے گئے تو اُن ہندوستانی علاقوں پرمسلمان صوفیوں، مبلغوں ، عالموں ، فاضلوں اوردانشوروں کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ گویاوہ ریاستیں بڑی حدتک اسلامی تہذیب وثقافت کے رنگ میں ہی رنگ گئیں۔ اگلی تین چارصدیوں سے پورے ہندوستان خصوصیت کے ساتھ دکن ، لاہور، دہلی اور پنجاب جیسے علاقہ جات اُسی طرح سے اسلامی تعلیمات کے روشن مرکز بن گئے جس طرح پہلے زمانوں میں وہ بُدھ مت اور ہندومت کی تعلیمات کے مرکز رہ چکے تھے۔ اُن تمام زرخیز اورمردم خیز علاقوں میں انسان دوستی، آپسی بھائی چارہ اورملنساری کی جوروشنی خاص طور پرحضرت داتا گنج علی ہجویری، حضرت معین الدین چشتی خواجہ اجمیری، نظام الدین اولیاء دہلوی، حضرت شیخ سلیم چشتی، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور حضرت شاہ بوعلی قلندر جیسے بلند پایہ روحانی مرشدوں اور بزرگ صوفیوں نے پھیلائی۔ انہیں صوفیاء کی تعلیمات کوبھگتی تحریک سے وابستہ بابا فرید، بُلے شاہ، گرونانک اور کبیر جیسے سادھوؤں اورسنتوں نے کئی نئی جہتوں سے ہم کنار کیا۔ جموں وکشمیر میں یہ روشنی قدرے تاخیر سے پہنچی۔ جب کشمیر میں حضرت سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ، حضرت سید حسین سمنانی اورشاہِ ہمدان، حضرت میر سید علی ہمدانی جیسے دینی عالم وفاضل اورمبلغ وصوفیا چودھویں صدی عیسوی کی پہلی چار دہائیوں کے دوران یکے بعد دیگرے کشمیر

میں وارد ہوئے ۔ان بزرگوں کے بعد اگلی دو صدیوں تک اُن کے تبلیغی مشن کو یہاں شیخ العالم نورالدین ریشی ،حضرت سلطان العارفین ،شیخ حمزہ مخدوم اور شیخ یعقوب صرفی جیسے روحانی کمالات والے بزرگوں نے اعلیٰ پایہ انسانیت آموز ،ذہن ساز اور دِل نواز مشن جان کر اس قدر مقبول بنادیا کہ فارسی زبان وادب کو رواج اور ترقی بخشنے والے عالموں اور شاعروں کی بدولت ''شاردا پیٹھ'' نام سے موسم کشمیر،اب ''ایران صغیر'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔ان ہی کے شانہ بہ شانہ،انسان دوستی اور امن وآشتی کی آبیاری کرنے والے مذکورہ صوفیوں اور ریشیوں کی دِل نوازی سے کشمیر اب پیرہ وار اور ریشی وار یعنی پیرومرشد قسم کے لوگوں کا تربیت کردہ علاقہ اور ریشیوں کی خدمتِ انسانی کا آئینہ دار علاقہ بھی کہلانے لگا۔لسانی پیش رفت کی رُو سے اور ادبی کارناموں کے اعتبار سے بھی جو خدمات طوطیِ ہند امیر خسرو،بلبل ہند مرزا غالبؔ، سرسید احمد خان اور شمس العلماء مولانا حالی اور مولانا شبلی جیسے شاعروں اور عالموں نے ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں انجام دی ہیں ۔ویسی ہی خدمات کشمیر میں للّہ عارفہ اور شیخ العالم کے بعد خواجہ حبیب اللہ حُمی ،مُلا محسن فانی ،غنی کشمیری ، محمود گامی ،مومن صاحب اور شمس فقیر جیسے صوفی شاعروں نے فارسی اور کشمیری زبانوں کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور اپنی لسانی اور اخلاقی وتہذیبی خدمات انجام دیں۔

صوبہ جموں کے مختلف اضلاع ڈوڈہ،ضلع پونچھ،ضلع راجوری وغیرہ میں بھی اسلامی صوفی اور عالموں نے اسلامی اور متصوفانہ تعلیمات کی تبلیغ کی ہے۔ضلع کشتواڑ میں حضرت شاہ فریدالدین بغدادی راجوری میں حضرت بابا غلام شاہ بادشاہ،حضرت بابا مستان شاہ غازی،اور ضلع جموں میں حضرت بابا روشن شاہ ولی،حضرت بابا بڈن شاہ وغیرہ نے خاص طور پر اسلامی اخلاقی تعلیمات کے فروغ میں ایک قابلِ قدر کام سرانجام دیا ہے ۔علاوہ ان کے شاہ عالم جیسے درجنوں مبلغوں اور درویشوں نے انسانی اقدار کو تقویت دینے میں گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔ان تمام روحانی بزرگوں کی کوششوں سے جہاں مہاتما بُدھ کے وہاروں کے حوالے سے بھارت مُلک کو گنگا جمنی تہذیب جیسی روشن تہذیب وثقافت ملی ہے۔وہاں اس تہذیب کی سب سے زندہ اور ملی جُلی علامت کا درجہ رکھنے والی وہ اُردو زبان بھی ملی

ہے جو فارسی کی جانشین ہونے کے ساتھ سنسکرت اور ہندی الفاظ کو بھی اپنانے والی ایک زندہ، فعال اور سیکولر زبان ہے۔ شومیہ قسمت ہے کہ دُنیا کو اہنسا کی تعلیم دینے، امن وآشتی کے گیت گانے اور صوفیوں کی درگاہوں میں قوالیوں پر وجد کرنے والے اسی ملک کے باشندے آئے دن جنگی جنون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انگریز ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے ایجنڈے پر عمل کر کے ہندوستان کو ایک صدی تک غلام بنائے رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن آزادی کی آدھی صدی بعد بھی دیوالی اور عید جیسی مقدس تقریبات مِل جُل کر منانے والے بھارت کے باشندے اپنے بزرگوں کی تعلیمات اور تہذیب وثقافت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ہماری ریاست جموں وکشمیر کو لکھنپور سے لے کر لداخ تک اور کشتواڑ، ڈوڈہ سے لے کر راجوری پونچھ اور اڑی کرناہ وکپواڑہ تک کی تہذیب وثقافت کو اگر کوئی زبان جوڑنے والی ہے تو وہ صرف اور صرف اُردو زبان ہے۔ ہندی اور اُردو کوئی الگ نہیں ہیں بلکہ دونوں زبانیں بہنیں ہیں اور دونوں مل جل کر اپنی گنگا جمنی تہذیب کی حفاظت کی ضامن ہیں۔ ہمارے لیے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم سب سچے دِل سے اپنے یہاں پروان چڑھی ہوئی ملی جُلی ثقافت کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی کوشش کریں تا کہ ہماری نئی نسلیں اپنی لسانی ساختوں، تہذیبی علامت ساتھ اپنے ملک کو مضبوط بنانے کے علاوہ امنِ عالم کو ممکن بنانے میں بھی اپنا گراں قدر حصہ شامل کر سکیں۔

ہمارے پاس اب بھی وقت ہے عالمی سطح پر ہماری ملی جُلی ثقافت وتہذیب کو ہمارے ہی ہاتھوں دفنانے والی سازشوں کو پہچان کر ہم اپنی مشترکہ تہذیب کے دِل نواز اور تعمیری عناصر کو پہچانیں اور مختلف سطحوں پر اُن کو پہنچنے والے امکانی خطروں کا دُور اندیشی سے کام لے کر ایسا پیشگی سدباب کریں تا کہ نہ تو ترقی کی راہ پر ہمارے قدم رُکنے پائیں اور نہ ہی تہذیبی قومیت کے نام پر بانٹی جانے والی نفرت یا علم کے نام پر پھیلائی جانے والی جہالت ہمیں اپنی لپیٹ میں لے سکے اور نہ ہی ہماری زبان وادب کو مالا مال کرنے والی غزل، مثنوی، رُباعی، بھجن، قوالی اور گیت جیسی وراثت کی روشن قندیلیں ہمیں صرف اس لیے فرسودہ اور پرانی لگنے لگیں کہ وہ سنسکرت، عربی، فارسی یا اُردو سے لی گئی ہے۔ اگر ہم انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی اپنی بیش بہا تہذیبی میراث کا عرفان پائیں اور اس کے حوالے سے اپنی اپنی دانشمندانہ روش

کا مظاہرہ کر پائیں تو ہم صرف اپنے دانشمند شعرا اور ادباء کی آواز میں آواز ملانے میں فخر محسوس کریں گے کہ:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا
مذہب نہیں سِکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہندوستان ہمارا

یہاں تک ہی نہیں بلکہ خود کو روشن ضمیر اور زندہ دِل صوفیوں اور سنتوں کی عطا کردہ انسان دوستی کی بصیرت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی روحانی آواز کو سننے کی کوشش کرنی ہوگی۔

چشتی نے جس زمین میں پیغام حق سُنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا! جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
مرکز فتنہ سازوں کے مندر، مسجد، گرجا، گھر

اکائی نمبر2: جموں وکشمیر میں اُردو زبان کے ابتدائی نقوش

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کے اثرات اس وقت نمودار ہونے لگے جب فارسی کا شاہانہ باک پن ضعیف ہونے لگا۔تقریباً چھ برس قبل اس دلفریب سرزمین پر ایک نیم جان تہذیب کے کھنڈرات پر فارسی عالموں نے ایک نئے اورتازہ دم معاشرے کی تعمیر کا آغاز کیا تھا لیکن فارسی کی نئی اُمنگ کے باوجود وہ سنسکرت سے دامن نہ چھڑا سکے۔اس بات کی کوئی داخلی شہادتیں دستیاب ہورہی ہیں کہ ابتداء میں شاہمیری سلاطین فارسی کے بجائے سنسکرت ہی میں دربار کا کام کاج اورامورسلطنت انجام دیتے رہے ہیں البتہ مغلوں کی عظیم سلطنت نے فارسی کی فرماں روائی کو یقینی بنادیا۔ یہاں تک کہ اسے مقامی زبان سے آمیز کرنے اوراس کوایک مقامی ریختہ کی شکل دینے کی کوشش کی گئی۔اگر کشمیر میں اُردو کی آمداوراس کے اثرات اوررسوخ وقبول کا جائزہ لیا جائے تواندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ عوامی زندگی میں فارسی کی جگہ کب کی حاصل کرچکی تھی اورسرکاری اوردرباری مقام پراس کی تصدیق محض ایک رسم کی حدتک تھی۔ 1827ء میں ایک مشہور کشمیری شاعروادیب اورصحافی ہرگوپال خستہ اپنی تصنیف ''گلدستۂ کشمیر'' میں لکھتے ہیں۔''گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ اُردو بولتے ہیں اور ہانجیوں وغیرہ طایفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں''۔

ریاست جموں وکشمیر میں پٹھا عہد کے خاتمے کے بعد سکھوں نے اپنی حکومت قائم کی۔سکھوں کے عہد میں ریاست کے لوگوں پر ظلم وزیادتیوں کی انتہا کردی گئی۔''گلگت بیگار'' کے حوالے سے مورخین نے کشمیری مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی جوتفصیلات پیش کی ہیں انہیں روح کانپ اٹھتی ہے۔وادی کشمیر کے علاوہ ریاست کے دیگر علاقوں میں بھی سکھوں کے مظالم، استحصالی اورغیرافسانہ رویوں کے سبب لوگ بیزار ہوچکے تھے۔نتیجتاً سکھ حکمرانوں کے غیرانسانی حرکتوں اورورویوں کے خلاف عوام کی احتجاجی اور باغیانہ سرگرمیاں عمل آنا شروع ہوگئیں۔ان سرگرمیوں کو کچلنے کی غرض سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک ڈوگرہ فوجی افسر گلاب سنگھ کو بھیجا جاتا رہا تھا۔نہایت جدوجہد کے باوجود جب

جموں وکشمیر میں حالات پُرامن نہ ہوئے تو 16 مارچ 1876 کوانگریزوں نے ''عہدنامہ امرت سر'' کے تحت 70لاکھ روپے کے بدلے ریاست جموں وکشمیر کی حکومتی باگ ڈور مہاراجہ گلاب سنگھ کوسونپ دی۔ گلاب سنگھ نے ریاست جموں وکشمیر میں ''ڈوگرہ راج'' کا قیام عمل میں لایا اوراپنی ذہانت، حکمت عملی اور بہادری سے کام لیتے ہوئے ریاست میں نہ صرف امن قائم کیا بلکہ ڈوگرہ راج کی سرحدوں کو پھیلا کر، اسکردو، لداخ، کشتواڑ، علاقہ جہلم اورراولپنڈی کے قریب تک جا پہنچادیا۔

اتنے سارے پس منظر کے بعداب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کا کیا مقام رہا ہے۔ گلاب سنگھ کے عہدِ حکومت میں ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری اوردفتری زبان اُردو بن گئی۔ ریاست کے مختلف علاقہ جات میں کشمیری، ڈوگری، لداخی، پہاڑی، بلی اور گوجری وغیرہ زبانیں اور بولیاں بولنے والے باشندے بھی تھے۔ اس طرح لسانی اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر ایک ایسا گلدستہ تھی جس میں رنگ برنگ پھول اپنی اپنی بہار دکھارہے تھے۔ سچائی یہ ہے کہ صدیوں سے اس ریاست میں بھی فارسی زبان کی حکمرانی رہی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ریاست کی زبانوں اور بولیوں میں فارسی کے الفاظ شامل وداخل ہوتے رہے ہیں۔ ریاست میں اسلام کی آمد کے سبب مقامی زبانوں اور بولیوں میں عربی الفاظ خاص طور پر ال، اظ وغیرہ کی شمولیت بھی ہوچکی تھی۔

اس طرح اُردوزبان میں فارسی ،عربی، ترکی، ہندی اور پنجابی کے الفاظ بھی خاصی تعداد میں شامل ہوگئے۔ اس لیے ریاست کی مقامی زبانیں بولنے والوں کواُردوزبان کے قبول کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ ڈوگری، پہاڑی، گوجری زبانیں پنجابی کے حوالے سے اُردو سے قریب تھیں ہی کشمیری زبان میں بھی فارسی، عربی کے الفاظ وتراکیب کی کثرت ہوگئی۔

ریاست میں اُردو کی نشوونما کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دراصل سکھوں کے عہد میں ریاست کے بہتر تعلقات پنجاب سے رہے تھے۔ خاص طور پر صوبہ کے صدرمقام لاہور سے۔ جموں وکشمیر کے الحاق کے سبب پنجاب سے

اُردوادب اور خاص طور پر صحافت کے نئے رجحانات جو پیدا ہوتے رہے ہیں وہ رجحانات جموں وکشمیر تک پھیلے رہے ہیں۔علاوہ اس کے ہندوستان کے دیگر اُردو مراکز سے بھی اُردو شعروادب کی روایات مختلف ذریعوں سے جموں وکشمیر میں متعارف ہوتی رہی تھیں۔گلاب سنگھ اخیر زمانے مس برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ کو ناکام بنانے اور آزادی کے متوالوں کو کچلنے کی خاطر ریاست سے جو فوجی دستے دہلی کو جاتے تھے وہ دہلی میں ایک عرصہ تک قیام کرتے تھے۔اس قیام کے بعد واپس لوٹنے تک ان فوجی دستوں کو اُردو زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہو جاتی تھی۔لیکن اس زیادہ موثر ترین موسیقی تھا۔قبل اس کے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی مقبولیت اور اشاعت کے سلسلے میں موسیقی عوام میں پسند رہی تھی۔ پہاڑی سازنگ نواز جن تک اُردو غزلوں اور گیتوں کی لے پہنچ چکی تھی اور وہ گھوم پھر کر عوام کو سناتے تھے۔جموں اور کشمیر ہر دو مقام پر بہت مقبول ہو گئے تھے۔

جموں وکشمیر کی موسیقی میں کشمیری بھانڈ جو اپنے کرتب اور فن کاری کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔اُردو میں ہندوستانی گیت گاتے تھے۔اُردو قوالی گانے اور سننے کی روایت عام ہو چکی تھی۔ 44-1843ء کے کئی مخطوطے جو زمین کی تحویل سے متعلق ہیں اکثر اُردو میں ہی موجود ہیں۔

گلاب سنگھ کے دربار سے کنارہ کش ہونے کے بعد رنبیر سنگھ نے براہِ راست، ریاست کے نظم ونسق کو برطانوی ہند کے معیاروں پر لانے کا آغاز کیا۔خاص بات یہ ہے کہ اس نئے نظام کا وسیلہ اُردو زبان تھی جو اس وقت تک برطانوی ہند میں فارسی کا مقام حاصل کر چکی تھی۔ ریاست میں فارسی زبان اب مقصدی یا افادی حیثیت کھو چکی تھی۔بل کہ علم وادب کے محرک اور دربار کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اُردو زبان کو آگے بڑھایا جا چکا تھا۔ریاست کے مدرسوں میں بھی اُردو زبان پڑھائی جا رہی تھی۔

مہاراجہ نے نئے علوم وفنون کو اُردو اور بعض دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے جو دارالرتر جمہ قائم کیا تھا وہ حقیقت میں اپنے حالات کے تقاضوں کا نتیجہ تھا۔درالترجمہ کے سارے عالم اُردو سے واقف تھے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کی

یہ ساری کوششیں ریاست میں اُردو زبان کا ذوق پیدا کرنے کے حوالے سے اُردو میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

قیصر قلندر نے اپنے مضمون ''کشمیر میں اُردو'' میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت سے آج تک اُردو زبان اسکولوں میں تعلیم کی افہام وتفہیم کا وسیلہ رہی ہے اور ریاست کے طلباء کی رسائی میں نئے علوم کی ترسیل کے لیے محکمہ تراجم کی جانب سے اُردو میں کثیر تعداد میں علمی کتابوں کے تراجم کئے گئے۔ محکمہ تراجم کو مہاراجہ رنبیر گنج کے نشیبی علاقے جہلم کے کنارے اس عمارت میں قائم کیا گیا تھا جہاں اب ہسپتال ہے۔ دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گوبند کول تھے۔

اس دارالترجمہ کے ذریعہ جو تعلیمی کتابیں تیار کی گئیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مختلف مضامین مثلاً علم طبقات الارض کا ترجمہ انگریزی سے ہندی میں، جیوگرافیا اور فزیکس کا انگریزی سے ہندی میں، جامع العلوم کا عربی سے فارسی میں، تاریخ فتح کا فارسی سے ہندی میں، تاریخ کشمیر اور تاریخ روم کا انگریزی سے ہندی میں کروایا گیا۔ انت رام شاستری ابتدائی دور کے لکھنے والوں کی طرح اُردو کو اُردو کے ہی ایک نام ہندی سے موسوم کرتے ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے عالموں میں بابو نصراللہ عیسائی نے ڈاکٹر جانسن کی کتاب ''کشمیر ہنڈ بک'' تاریخ رہنمائے کشمیر کے سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم سے اُردو میں کیا گیا اور مکمل ہونے کے بعد ان کی خدمت میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ ترجمہ کرنے کا سنہ 1874ء درج ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُردو کی ترویج وترقی کی طرف خاطر خواہ توجہ دلائی۔ دفتری کاروائی اُردو میں کی جانے لگی۔ جس سے اُردو کی مقبولیت کے لیے ایک ماحول تیار ہوا۔ اسی دوران ڈوگرہ راج نے ایک پریس بھی قائم کیا جہاں سے اُردو اور دیوناگری میں ایک ذولسان اخبار بھی جاری ہوا۔

اسی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے 1885ء میں باضابطہ اور باقاعدہ طور پر اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کی غرض سے سرکاری حکم نامہ جاری کیا۔ اس دوران بہت سے اہل علم ہندوستان کے دیگر شہروں سے ریاست میں آتے رہے۔ اس طرح ریاست رفتہ رفتہ بیرونی علمی، ادبی، مذہبی اور معاشرتی اقتدار ورجحانات سے شناسا ہوتی رہی۔ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ریاست میں اُردو نے ترقی اور اعتبار کی بہت سارے

منزلیں طے کر لی تھیں۔ درس وتدریس سے ادب وصحافت تک اُردو زبان کی حکمرانی ہونے لگی۔ آزادی کے بعد اگر چہ سارے ہندوستان میں اُردو زبان کے ساتھ ناروا سلوک رکھا گیا لیکن اس کے باوجود ریاست جموں وکشمیر میں صورتِ حال قدرِ مختلف رہی ہے۔ تخلیقی سطح پر شاعروں، افسانہ نگاروں، ڈراما نگاروں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے موجود ہے جنھوں نے اپنے جذبات، تجربات، خیالات، مشاہدات، مطالعات اور تصورات کے اظہار کی خاطر اُردو زبان کو ہی اپنا وسیلہ بنایا ہے۔ اس طرح ریاست میں اُردو کے فروغ کو ہم کسی نہ کسی طرح شعراء، صحافیوں اور ادیبوں کی خدمات سے جوڑتے ہیں۔ علاوہ اس کے ریاستی سطح پر یونی ورسٹیوں جیسے جموں یونیورسٹی جموں، کشمیر یونیورسٹی نے بھی اُردو کی ترویج واشاعت میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

ادبی انجمنوں جیسے ترقی پسند اُردو، انجمن فروغ اُردو، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی، کمرا ادبی مرکز، اُردو اکادمی (نورشاہ) وغیرہ بھی اُردو کے فروغ میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ ریاست میں کام کرنے والے دیگر سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ادارے بھی اُردو کی ترویج واشاعت میں پیش پیش ہیں۔

آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں اٹھارہ زبانوں کو قومی یا علاقائی زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پندرہ زبانیں علاقائی حیثیت رکھتی ہیں لیکن تین زبانیں اپنا کوئی خاص علاقہ نہیں رکھتی۔

ا۔ سنسکرت۔ ۲۔ انگریزی اور ۳۔ اُردو۔ اُردو بولنے والوں کی تعداد اب بھی سب سے زیادہ ہے۔ اُردو کو مادری زبان تسلیم کرنے والوں کی سرسری تعداد کروڑوں میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کروڑوں لوگوں کی دوسری زبان ہے۔ ہندوستان کے کسی خطے یا ریاست کی سب سے بڑی زبان نہ ہونے کی وجہ سے اس کو کہیں بھی سرکاری زبان کا درجہ سوائے ریاست جموں وکشمیر کے حاصل نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کئی ریاستوں میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قومی سطح پر اُردو کی تعلیم وترویج کے خاطر خواہ انتظامات بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اُردو اپنی شیرینی انسان دوستی اور دلکشی کے سبب نہ صرف زندہ ہے بلکہ مقبولیت کی نئی منزلیں طے کر رہی ہے۔

اکائی نمبر 3: جموں وکشمیر کے صوفیا اکرام اور اردو زبان

پنڈت کلہن نے اپنی مشہور کتاب ''راج ترنگنی'' کے پہلے ہی ترنگ (باب) میں اِس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ہمارے وطن جموں وکشمیر کو قُدرت کے سخی ہاتھوں نے ایسے فطری حُسن اور کشش سے نوازا ہے کہ اس کے برف پوش پہاڑوں، گھنے سرسبز جنگلوں، صاف اور میٹھے پانی کے چشموں، جھرنوں اور آبشاروں کے نزدیک بسنے والے کسی بھی دور میں رُوحانیت اور مذہب پسندی سے دُور نہیں رہ سکتے۔ ایک مورّخ کی اِس سوچ میں کشمیر کے سب ہی نیک دِل اور حساس اِنسان کسی نہ کسی طرح شامل رہے ہیں بلکہ اِسی اجتماعی سوچ کے پسِ منظر میں یہ تاریخی شہادت بھی ملتی ہے کہ گرچہ چودھویں صدی عیسوی میں تُرکستانی یا وسط ایشیائی اور ایرانی صوفیوں کی جماعتیں مختلف کاروانوں کی صورت میں کشمیر پہنچے لیکن اِس سے بہت پہلے یہاں ریشیوں، سادھوؤں اور سنتوں نے تصّوف کے پنپنے کا ماحول سازگار بنا رکھا تھا۔ اُن کی تپسیا، ریاضت ذکر وفکر اور دھیان وگیان کی روایت نے دِلوں کی زمین اِس قدر ہموار کر رکھی تھی کہ کوئی بھی مخلصانہ بحث وتمحیص اور زاہدانہ عمل اپنا اثر دِکھائے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ حالانکہ مُشکل یہ تھی کہ صدیوں سے قدیم ریشیوں اور سنتوں کے ہاں رائج رہی سِر یت Mysticism برِصغیر میں زیادہ تر منفی رُجحانات، رہبانیت اور ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتی رہی تھی۔ گویا سنتوں کی اکثریت گھر بار چھوڑ کر ہی گیان پانے کی وکالت کرتی رہی تھی۔

ایک لحاظ سے خطہ کشمیر ریشیوں، مُنیوں اور سادھوؤں سنتوں کے ترکِ دُنیا کے حوالے سے بجائے خود چھوٹا ہندوستان بن گیا تھا۔ یہاں بُدھ مت کے گہرے اثرات بھی موجود تھے اور پھر شِومت کے نظریات بھی اِس رُجحان کو تقویت بہم پہنچانے والے معلوم ہوتے تھے۔ اِس پسِ منظر میں جو سیاسی افراتفری گذشتہ تین سو سال سے کشمیر کے حصّے میں آئی تھی یعنی جو سیاسی اُتھل پُتھل گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران اِس خطے کے حصّے میں آئی تھی۔ اُس نے کشمیر کے عام لوگوں کو بہت پریشان کر دیا تھا اور وہ اندر ہی اندر ایک ہمہ گیر انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آخر وہی پریشانی چودھویں صدی کے آغاز میں وسطِ ایشیا اور ایران کے ساتھ گذشتہ آٹھ صدیوں سے کشمیر کے تجارتی اور

ثقافتی تعلقات میں ایک نیا موڑ پیدا کرنے کا باعث بن گئی۔ چنانچہ کشمیر کے تاجروں نے ہمسایہ ممالک میں جا جا کر نہ صرف کشمیر کی ابتر داخلی حالت کا رونا رویا بلکہ وہاں کے رُوحانی بزرگوں کو بھی کشمیر کے حالات پر توجہ فرمانے اور دُعاؤں سے مدد کرنے کی درخواستیں کیں۔ اِس حقیقت کا زیرِ لب اظہار پنڈت کلہن کی مشہور تصنیف ''راج ترنگنی'' میں کئی طرح سے ہوا ہے اور بعد کے فارسی تذکروں میں بھی کئی سرکردہ کشمیریوں کے بابا بلبل شاہ ترکستانی سے جا کر ملنے کی بات کہی گئی ہے۔ اُس بُزرگ صوفی کے چند سال بعد ہی کشمیر کے ایک سرکردہ پنڈت شری کنٹھ نے حضرت شاہِ ہمدان میر سیّد علی ہمدانی کے پاس پہنچ کر اُنہیں کشمیر تشریف لانے کی دعوت دی اور پھر اُن کی تشریف آوری کے بعد اُس نے خود بھی اسلام قبول کر لیا اور شیخ سلیمان کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس زمانے کے مُسلمان درویش اور صوفی لوگ اعلیٰ مثالی کردار کے مالک ہونے کے علاوہ اسلام کی تبلیغ کے لیے ذاتی آرام حرام کرنے والے ایک اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مُشکل سے مُشکل مرحلہ طے کرنے والے ہوتے تھے۔ اِسی اعلیٰ تبلیغی مقصد کے تحت جب پہلے مشہور صوفی سیّد شرف الدین عبدالرحمان بُلبُل شاہ تُرکستانی ۱۳۳۶ء کے آس پاس کئی درجن ساتھیوں سمیت سرینگر پہنچے تو اُس وقت کشمیر کے پُشتینی راجاؤں سے آپسی پھوٹ کے سبب اِقتدار چھِن چکا تھا۔ اور یہاں لداخ کا ایک شہزادہ رینچن نام سے حکُمران بن گیا تھا۔ وہ بھی سرکردہ برہمنوں اور بدُھ بھکشوؤں کی باہمی چقلش اور اپنے امیروں وزیروں کی سطح پر بڑھتی ہوئی روز روز کی سر پھٹول سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر چند وزیروں اور ہِندو بیوی ''کوٹہ رانی'' کے اِس مشورہ کو بڑے غور و فکر کے بعد قبول کر کے وہ سو گیا کہ ایک دُوسرے کے مذہب کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے ہم سب اُس شخص کا مذہب قبول کریں گے جس پر کل صُبح سب سے پہلے راجا اور رانی کی نظر پڑے گی۔ خواہ وہ ہندو ہو یا بودھ۔ خُدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُسی رات وسطہ ایشیا سے آئے ہوئے ایک تجارتی کاروان میں کئی عالم و فاضل شامل ہونے کے علاوہ بابا بُلبُل شاہ تُرکستانی جیسے رُوحانی بزرگ بھی شامل تھے۔ انہوں نے شاہی محل کے نزدیک ہی دریائے جہلم کے اُس پار ڈیرہ ڈالدیا تھا۔ جب انہوں نے کشمیر کی سرزمین پر راج محل کے نزدیک صبح کی اذاں دی راجہ اور رانی دونوں جاگ پڑے۔ وہ اچنبھے سے اُس طرف متوجہ ہو گئے۔ اور روشنی پھیلنے تک اپنی کھڑکی سے کئی بار اُس کاروان میں شامل لوگوں کو دیکھنے کے لیے سر باہر

نِکالتے رہے۔ پھر جب دِن کی روشنی پھیلی تو اُنہوں نے کاروان کے سامنے بعدِ نماز والی دُعا مانگتے ہوئے بُلبُل شاہ کو اُونچی پگڑی باندھے دیکھ لیا اور جلد ہی اُن کو اپنے پاس بُلوا لیا۔ راج محل کے آس پاس دُوسرے مذہبوں کے لوگ بھی آدھی رات سے ہی اِس اُمید پر پہنچ گئے تھے کہ راجہ اپنے محل سے نِکلتے ہی مجھ پر نظر ڈالیں گے اور اپنے وعدے کے مُطابق میرا ہی دھرم اِختیار کر لیں گے۔ لیکن وہ سب اچنبھے میں پڑ گئے جب اُنہوں نے راجہ اور رانی دونوں کو شاہی گیٹ سے نِکل کر ایک اجنبی سے مِلنے کے لیے یہ کہتے ہوئے بیتاب پایا کہ ''دوستو آج سب سے پہلے ہماری نظر اُس (آتے ہوئے) پگڑی والے پر پڑی ہے۔ ہمیں اُس کا دین دھرم پوچھنے دو۔ پھر ہم اپنی پریشانی دُور کرنے کا راستہ اُسی سے پُوچھ کر سب کے لیے مُتعین کریں گے۔'' اِس ڈرامائی مکالمے کی اصل صورت کیا رہی ہوگی، اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ بابا بُلبُل شاہ تُرکستانی نے جِن کے ساتھ مولانا احمد علامہ جیسے لوگ بھی تھے۔ جب راجہ کو اِس بیتابی سے تصّوف کی باتیں سمجھنے کے لیے بیقرار پایا تو وہ مقامی زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان جاننے والا شخص تلاش کرنے لگے۔ خوش قسمتی سے راجہ رینچن کا وزیر یہ دونوں زبانیں جانتا تھا۔ بلکہ وہ دینِ اِسلام سے بھی مشرف یاب ہو چکا تھا اور کشمیر کا پہلا معروف مُسلمان ہونے کی حیثیت سے مشہور تھا۔ بابا بُلبُل شاہ کا یہ ترجمان دیکھتے ہی دیکھتے کشمیر کے بااثر لوگوں اور بُزرگ صوفی کے درمیان ایسا پُل ثابت ہوا کہ اگلے چند مہینوں میں ہی ہزاروں کشمیریوں نے امنِ عالم، انسانی بھائی چارہ اور اِنسانی مساوات، کی دعوت دینے والا اِسلام قبول کر لیا۔ ایک عربی مقولہ ہے کہ ''النّاسُ علیٰ دینِ ملُوکھِمہ'' یعنی عام لوگ جھٹ اپنے حکمرانوں کا دین قبول کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ جب صوفی تعلیمات کا متوالا بن کر بُدھ مت کا پُجاری ''رینچن'' دیکھتے ہی دیکھتے مُسلمان بن گیا تو اُس نے فخر سے صوفی بُزرگ کا دیا ہوا نیا نام ''سلطان صدرالدین رینچن شاہ'' بڑی عقیدت سے اپنا لیا۔ اور یوں رینچن شاہ کے امیروں وزیروں کے علاوہ سینکڑوں بااثر لوگوں نے بھی نیا دین اِختیار کر کے صوفی بُزرگ اور سُلطان راجا سے زیادہ خُدا کو خوش کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ جیسا کہ صوفیوں اور مبلغوں نے اُنہیں یقین دِلایا۔ یاد رہے کہ بُلبُل شاہ تُرکستانی تصّوف کے سہروردی سلسلے کے ساتھ وابستہ تھے۔ البتہ اُن کے بعد سات سو مُبلغوں، عالموں اور صوفی مزاج لوگوں سمیت ۱۳۷۲ء میں جو عظیم صوفی بُزرگ کشمیر میں داخل ہوئے وہ امیر

کبیر۔حضرت میر سیّد علی ھمدانی تھے جن کو پیار سے کشمیریوں نے ''شاہ ھمدان'' کے نام سے یاد کیا ہے۔حضرت شاہ ھمدان اور اُن کے ساتھیوں نے کشمیر آ کر اِنسانیت، اخلاق، بھائی چارے اور نیکیوں کی باتیں صوفیانہ زبان میں اِسلام کے حوالے سے اِس مٹھاس ، پیار اور نیک نیتی کے ساتھ پیش کیں کہ یہاں کے خواص اور عوام اُن کے گرویدہ اور عقیدتمند بن گئے۔اُس وقت کے بادشاہ، سلطان قطب الدین شہمیری پر بھی اُن کی تعلیمات کا اتنا اثر ہوا کہ وہ اپنی سلطنت کا کچھ حصّہ تک اُن کو دینے پر آمادہ ہو گئے اور اُن کے نکاح میں بیک وقت جو دو بہنیں تھیں، اُن میں سے اِسلامی حکم کے مُطابق ایک کو فوراً طلاق دے دی۔ بادشاہ نے حکومت کے طریقے اور عبادت کے طریقے میں بھی صوفیوں کی ہر اصلاح سچے دِل سے قبول کرنے کو ہی اپنی سلطنت قائم رکھ سکنے کا بابرکت وسیلہ گردانا۔ اب حالات اِس قدر بدل گئے کہ حُکمران اور اُن کی رعایا آپس میں سگے بھائیوں کی طرح ایک دُوسرے کے خیر اخواہ بن گئے، بلکہ وہ پُوری دُنیا کے لیے یہ بات ظاہر کرنے کا جامِ جم بن گئے کہ دیکھو تاریخِ کشمیر کی رُو سے اِسلام کس طرح بغیر کسی شمشیر اور جبر کے پھیلا ہے۔شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے فارسی میں شاہِ ھمدان کی ہمہ گیر دَین اور کشمیر نوازی کا ذکر اِن خاص الفاظ کی شکل میں کیا ہے ؎

سیّدُ السادات سالارِ عجم　　دستِ اومعمارِ تقدیرِ اُمم

خطہ را آن شاہِ دریا آستین　　داد علم وصنعت وتہذیب ودین

آفرید آن مرد ایرانِ صغیر　　با ہُنر ہای عجیب ود پذیر

یعنی سیّدوں، عالموں اور صوفیوں کے اُس ممتاز سردار نے قوموں کی تقدیر بدلنے کے عملی اقدام کو روشن تر بنا کر بڑا کام انجام دیا ہے اور ذخیرۃ الملوک جیسی عالمگیر افادیت والی ایمان افروز کتاب لکھ کر آپ نے کشمیر کو دینی و اخلاقی تعلیمات سے منور کر دیا۔آپ نے طرح طرح کی کشمیر نوازی سے کام لے کر خطۂ کشمیر کو نئے علوم، نئی صنعت وحرفت، نئی تہذیب وثقافت اور نئے مذہبِ اسلام کی پُوری روشنی بہم پہنچائی ہے اور یوں اُس مردِ کامل نے ''شاردا پیٹھ'' نام کا علمی

مرکز رہنے کے بعد کئی صدیوں سے زوال پذیر ہو چکے کشمیر کو نئے علوم وفنون کا مرکز بنا کر عملاً چھوٹا ایران بنا دیا۔

چودھویں صدی عیسوی کے دوران ہی صوفیوں کا تیسرا بڑا کاروان وسط ایشیا سے نکل کر ۱۳۹۳ء میں کشمیر پہنچا۔ تقریباً تین سو اعلیٰ پایہ صوفیوں، مُبلغوں اور عالموں پر مُشتمل اِس کاروان کے سربراہ اور میرِ کاروان حضرت شاہِ ھمدان کے اکلوتے فرزند حضرت میر محمد ھمدانی تھے۔ اگرچہ اِن بُزرگ باپ بیٹوں کا تعلق تصّوف کے کُبرویہ سلسلہ اور شافعی مسلک کے ساتھ تھا۔ پھر بھی وُسعتِ قلبی اور انّوت نوازی کی آبیاری کے لیے آپ نے بُلبُل شاہ ترکستانی کے رائج کردہ سلسِلے اور مسلک کوجوں کا توں جاری رہنے دیا۔ کیوں کہ یہ سارے مسالک کے ماننے والے ایک ہی آقائے نامدار کے نقوشِ قدم پر چلنے کی اپنی اپنی توجیہہ کو بڑے خلوص اور بے غرضی کے ساتھ روشنی کی مانند پھیلانے میں مگن رہے تھے۔ اپنے والدِ محترم کے تصّوف پر لکھے گئے تقریباً ایک سو پچاس چھوٹے بڑے رسالوں کا غائر مُطالعہ کرنے کے بعد میر محمد ھمدانی نے بھی تصّوف پر کئی رسالے لکھے۔ خاص طور پر اُنہوں نے دِل روشن کرنے والے مباحث ''شمسیہ'' نام کی کتاب کو ''لمحات'' نام سے تحریر کر کے صوفیاء وقت میں ایک اور اِمتیاز حاصل کر لیا تھا۔ میر محمد ھمدانی وہی عظیم کشمیر نواز شخص ہیں جنھوں نے کشمیر کے سب سے مقبول اور مشہور ریشی حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین کشمیری کے مُرشد بن کر اُن کو ''خطِ اِرشاد'' سے نوازا تھا اور جن کی اِنسان دوست تعلیمات کو عملی جامہ پہنا کر سلطان زین العابدین ''بڈشاہ'' نام پا کر کشمیر کے سب سے بڑے روادار اور مقبول حُکمران کہلائے۔ بعض محققوں کی نظر میں ہندوستان کے مشہور مغل شہنشاہ ''اکبرِ اعظم'' نے بڈ شاہ کے اصول ''رعایا پروری'' پر ہی اپنی حکمت عملی کی بُنیاد رکھی تھی۔ کشمیر کی پہلی مُسلمان سلطنت ''شہمیری سلطنت'' کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کا عرصۂ حکمرانی ۱۳۳۹ء سے ۱۵۵۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ پورا دور کشمیر میں صوفیوں، ریشیوں اور مُبلغوں کے ذریعے دِلوں کی روشنی پھیلنے کا دور تسلیم کیا گیا ہے۔ اِس کے آخری تیس پینتیس برسوں میں چند افراتفریاں شروع ہو گئیں جو اگلے چک دور میں عروج کو پہنچ گئیں۔ پھر مغلوں کی طرف سے کشمیر پر حملے شروع ہو گئے اور صوفیوں کا مشن کمزور پڑنے لگا۔ لیکن تب تک صوفیوں کے اثرات کشمیریوں کے رگ وریشہ میں جگہ بنا چُکے تھے۔

اکائی نمبر 4: جموں وکشمیر کی مقامی زبانوں اور اردو کا رشتہ

ریاست جموں وکشمیر کرۂ ارض پر جس طرح اپنے قدرتی حسن و جمال اور رنگ برنگے مناظر کے اعتبار سے منفرد و یکتا حیثیت کی حامل ہے اسی طرح مختلف زبانون اور بولیوں کے اعتبار سے بھی ایسا خوبصورت اور منفرد گلدستہ ہے جس میں درجنوں زبانیں اور بولیاں اپنی حیرت انگیز ادبی خصوصیات کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ جموں وکشمیر میں چھوٹی بڑی 52 زبانیں اور بولیاں ہیں جن میں آٹھ بڑی زبانوں کشمیری، ڈوگری، لداخی، بلتی، دردی، پنجابی، پہاڑی اور گوجری کو آئینی تحفظ حاصل ہے۔ ماہرین لسانیات کی اکثریت کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کی تمام زبانیں اور بولیاں ہندآریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جموں وکشمیر تین صوبوں پر مشتمل ہے۔

1۔ جموں 2۔ کشمیر 3۔ لداخ

لکھن پور سے بانہال تک کا علاقہ جموں کہلاتا ہے۔ جس کو سنسکرت میں دوگرت کہتے ہیں جس کا مطلب دشوار گذار راستوں والا علاقہ اور ڈگر میں بولی جانے والی بولی ڈوگری کہلائی۔ جموں کی مقامی زبان ڈوگری ہے۔ یہ بولی جموں، ادھم پور، رام نگر، کٹھوعہ، بسوہلی اور کانگڑہ میں بولی جاتی ہے۔ ڈوگری زبان لسانی اعتبار سے پنجابی اور اُردو سے قریب ہے۔ پروفیسر عبدل قادر سروری ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جموں اور اس کے نواح میں پنجابی لہٰذا پہاڑی یا ڈوگری جو زبانیں رائج ہیں وہ اردو کی ہمزاد ہیں۔ ان میں صرف لفظی سرمایے کا اشتراک ہی نہیں بلکہ لسانی قالب اور جملوں کی ساخت پرداخت کی مشابہت بھی موجود ہے اس لئے اُردو ان علاقوں میں پہنچتے ہی ابتدائی جان پہچان کے بعد ان کی ہمجولی بننے لگی''

معانی ومطالب اور لب و لہجے کے اعتبار سے ڈوگری زبان اردو کے قریب ہے بلکہ سننے میں دونوں میں کم و

بیش مماثلت ہے۔ ڈوگری اور اردو میں بڑا فرق رسم الخط ہے۔ ڈوگری گورمکھی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جب کہ اردو نستعلیق رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اصوات کی تعداد کے تعین میں اردو کی نسبت ڈوگری کے ماہرین میں قدرے کم اختلاف پایا جاتا ہے۔ گریرسن نے ڈوگری کو پنجابی کی بولی بتایا ہے، لیکن ڈوگری کے علماء اس رائے سے متفق نہیں ہیں اور ڈاکٹر، سدھیشور ورمانے بھی اسے پنجابی سے مختلف، اور سرحدی زبان شمار کیا ہے۔

اردو اور گوجری زبان کے درمیان گہرے لسانی رشتے موجود ہیں۔ بقول نجیب اشرف ندوی ''جتنا گہرا لسانی رشتہ گوجری اور اردو کا ہے شاید ہی کسی اور دو زبانوں کا ہو۔'' قدیم اردو ادب یا دکنی ادب کے مطالعے سے بھی ان زبانوں کی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً امیر خسرو کا یہ شعر:

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، انہاں پیا ملن کی آس

اگر اردو اور گوجری کے لہجے کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ شعر جدید اردو سے زیادہ گوجری زبان سے ملتا ہے۔ گوجری اور اردو دونوں زبانوں کا آپس میں کئی اعتبار سے بڑا تعلق ہے۔ اردو کی طرح گوجری بھی جموں وکشمیر سے باہر بھی بولی جاتی ہے اور اپنے قدیم ادبی ورثے کے اعتبار سے جو قدیم اردو کے نام سے مشہور ہے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

جموں وکشمیر میں بولے جانے والی گوجری یا پھر قدیم گوجری کا یہاں تک اردو زبان سے تعلق ہے تو اصولِ قواعد کے مطابق گوجری اور اردو کے لسانی رشتے کی گہرائی اور اشتراکیت بہت مماثل ہے۔ ان کی صرفی نحوی تراکیب، فعلی مادوں، مصادر، فعلی تراکیبوں، کلمات استفہامیہ، کلمات اشارات، کلمات زمانی، شخصی ضمائر، اعداد توصیفی محاورات، ضرب الامثال، کہاوتیں ذخیرہ الفاظ، تراکیب و بندش، جملوں کی ساخت لہجے اور روایات، تلمیحات واشارات اور طرزِ فکر واحساس دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ مثال کے طور گوجری زبان کے نمونے دیکھئے جس نے بعد میں اردو کا نام

حاصل کیا اور یہ ہی اردو زبان کی بنیاد بھی ہے۔

یو سوارتھ کو جیو ڑ و سوار تھ چھوڑ نہ جائے
جب گوبند کی کرپا کری مارو منود سمجھیو آئے

☆☆☆

جیو کسو نہ بھلی دھن پنو کا سونہ اٹھو
دونی دی اوسری وادی تن سو ان گنائی ڈٹھو

☆☆☆

در دروازے جاءِ کے کیئو ڈٹھو گھڑیال
ایہہ ندوسا ماریئے ، ہم دوساں دا کیا حال؟

☆☆☆

بار پرائے بیسنا سائیں مجھے نہ دیہہ
جے توں ایویں اکھسی ، جیو سریروں لیہہ

☆☆☆

تنہا ں مکھ ڈراونے جنہاں وساریو ناؤں
اتھے دکھ گھنیرے آگے ٹھور نہ ٹھاؤں

☆☆☆

پچھلی رات نہ جاگیو جیو ندڑو مویوں
جے تیں رب وساریا رب نہ وسریوں

مذکورہ بالا اشعار تیرھویں صدی کے ہیں جو قدیم اردو کے نمونے ہیں لیکن ان اشعار کا اگر آج کی گوجری سے موازنہ کیا جائے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً بیسنا (بیٹھنا)، ٹھور (تھوڑا)، جنہاں (جن کو)، تنہاں (ان کو)، میرو (میرا)، کیو ڈٹھو (کیا دیکھا) اور پھر آخری شعر تو پورا آج کی گوجری زبان پر مشتمل ہے جس میں جا گیو (جاگا)، جیوندڑو (زندہ)، تیں (تم نے)، وساریا (بھول جانا)، نہ وسریو (نہیں بھولا) وغیرہ الفاظ آج بھی گوجری زبان کا سرمایہ ہیں۔

امیر خسرؔو کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو جا بجا گوجری کلام کا سامنا ہوگا:

ایسو پیر پایو نظام الدین اولیاء

عرب یار تیرو بسنت منایو

اس شعر میں ایسو (ایسا)، پایو (پانا) تیرو (تیرا)، منایو (منایا) وغیرہ خالص گوجری زبان کے الفاظ ہیں۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین جیسے ماہرین لسانیات نے اردو کی ابتدائی نثر مانا ہے کی ایک مختصر عبارت نمونے کے طور پر پیش ہے:

''ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پَیلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی۔''

اس عبارت میں تن (جسم)، ہور (اور)، پَیلا (پہلا) جیسے الفاظ گوجری کا ثبوت ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا:

''یہ گجری اردو کی بنیادی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے دیسی الفاظ کو کثرت سے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ سارے قدیم گجری شعراء اسی زبان و بیان کے ترجمان ہیں۔''

مشترکہ زبان گوجری اور اردو کے باہمی اشتراک کو اگر قواعد یعنی علم ہجا، علم صرف اور علم نحو کے ترازوں میں تولا جائے تو بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً:

لفظ موضوع:

اردو	گوجری
کھانا	کھانا/کھانو
عبادت	عبادت
نیک	نیک
مکان	مکان
دکان	دکان

کلمہ/ جملہ:

اردو	گوجری
قران مجید اللہ کی کتب ہے	قران اللہ کی کتاب ہے
ہر مسلمان پر نماز فرض ہے	ہر مسلمان پر نماز فرض ہے
خدا پر بھروسہ رکھو	خدا پر بھر سور کھو
تم نے کبوتر اڑایا	تم نے کبوتر اڑایو/ اڑایو
وہ آتی رہے گی	وہ آتی رہے گی۔۔۔۔۔۔۔وغیرہ

اردو، آخر میں (ا) آتا ہے جبکہ گوجری میں (و)، جمع کی صورت میں (ا) آخر میں آتا ہے جبکہ اردو میں (ین، ے) وغیرہ آتے ہیں مثلاً:

اردو	گوجری
میں اسکول جاؤں گا	ہوں اسکول جاؤں گو
وہ کہاں گئے ہیں	ویہہ کیاں گیا ہیں
وہ آتا رہے گا	وہ آتو رہے گو
ہم آتے رہیں گے	ہم آتا رہاں گا
وہ روئے گا	وہ روئے گو

اردو میں ''ہوں'' کوئی الگ ضمیر نہیں جبکہ گوجری میں ''ہوں'' (میں) ایک ضمیر ہے جو واحد مونث یا مذکر متکلم کو ظاہر کرتی ہے مثلاً:

اردو	گوجری
میں رو رہی ہوں	ہوں رو رہی ہوں
میں پکڑوں	ہوں پکڑوں
میں گئی ہوں	ہوں گئی ہوں

اب تک تو قدیم اردو اور گوجری کے اشتراک کے ثبوت پیش کئے گے جو کافی حد تک لازم وملزوم ہیں۔ جموں و کشمیر میں بولی جانے والی گوجری زبان کے گوجری شعرا کے کلام کو بھی نمونے کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے تا کہ اندازہ ہو سکے کے کس قدر گوجری زبان اور اردو میں مماثلت ہے:

خیراں نال رب اپنو دیس دسے پورو ہوئے ارمان تمام میرو
ذبیح پونچھ ، کشمیر روجور ، جموں سارا دیس ناں ہوئے سلام میرو

☆☆☆

س۔ سال کئی گزریا بچھڑیا ں ناں گزر گئی اک عمر تنہائیاں ماں
حائل ہوئی بچکا ر دیوار پہڑی انگا اونگا کا سجناں پہیائیاں ماں

ڈاکٹر صابر آفاقی جنہوں نے گوجری زبان و ادب کی آبیاری میں کافی محنت کی۔ حمد کا ایک نمونہ ''پیغامِ انقلاب'' سے:

نیلو فرش بچھایو ، رب نے تنبو اُچو لایو، رب نے
سارو جگ لشکایو ، رب نے لاٹو ایک جلایو رب نے
فر اس ماں انسان بنایو
رونق کو سامان بنایو

ایک نظم سے ایک بند:

اپنو آپ سیان رے پہائی خود ناں ہن پہچان رے پہائی
سچا رب ناں جان رے پہائی یو ای کہے قرآن رے پہائی
اپنی ذات نظارہ دیئے
فطرت کا لشکارا دیئے

میاں نظام الدین لاروی جو بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کے گوجری کلام سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

اتھرواں نا پچھے کوئی دسو کتوں آویں تم
کڈھ کے رَت کلیجہ بچوں پانی کیوں بنانویں تم

محمد اسرائیل آثر:

چھپا رکھیو تھو آج تک راز الفت میں زمانہ تیں
توں بُلبُل کس تیں سن آئی آثر کا دل کو افسانو

متذکرہ بالا قدیم اردو کلام اور گوجری کلام کے درمیان بحث سے ان کا آپسی رشتہ تلاش کرنا مشکل نہیں، چونکہ

دونوں زبانوں کی صوتیات ایک جیسی ہیں اور بغور مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ گوجری صوتیات بہت قدیم ہیں جبکہ اردو زبان جدید ہے۔

کشمیر کی علاقائی زبان کشمیری ہے اور لوگ اسے مادری زبان کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ کشمیری زبان کا رسم الخط فارسی ہے۔ یہ رسم الخط ''سلطان زین العابدین'' کے دور میں حاصل ہوا تھا۔ اس نے کشمیری ادب کے فروغ پر کافی توجہ دی تھی۔ کشمیری اور اردو زبان کے بہت سے الفاظ مشترک ہیں لیکن قواعد میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اگرچہ کشمیری زبان میں اس کا سرمایہ ادب موجود اور محفوظ تھا تاہم یہ علاقائی زبان تھی۔ یہاں کے لوگوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصے سے اپنی تمنّاؤں اور خوابوں کے اظہار وسیلہ بنایا تھا۔ اس وادی کے لوگ جنہیں قدرت نے شاعرانہ ذوق بھی بخشا ہے۔ قدرت کی فیاضیوں کی دِل کھول کر داد دیتے ہیں۔ چنانچہ کشمیر کے شاعروں نے اپنے وطن کی رعنائیوں اور حب الوطنی کے گیت جس کثرت سے گائے ہیں شاید ہی دنیا کی کوئی اور زبان اس سلسلے میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اس میں کشمیری زبان کے شاعروں کا بھی حصہ ہے اور فارسی اور اردو شاعروں کا بھی۔

مختصر یہ کہ جموں و کشمیر کے تینوں صوبوں کی علاقائی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسی زبان ہو جو تینوں صوبوں میں رابطے کا ذریعہ بنے، اور تین لسانی اور تہذیبی خطّوں یعنی جموں، لداخ اور کشمیر کے درمیان رابطے کی زبان کا درجہ حاصل کرے۔ جموں کے باشندے کشمیری سے ناآشنا تھے اور کشمیر کے لوگ ڈوگری سے۔ اور لدّاخ کے لوگ ڈوگری اور کشمیری دونوں سے ناواقف تھے۔ مواصلات کا انتظام کچھ بھی اچھا نہیں تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی آمد رفت عام ہوتی۔ کچھ عرصہ کے بعد مواصلاتی انتظام بہتر ہونے لگا اور ہندوستان اور پنجاب سے لوگ کشمیر آنے لگے۔ حکومت نے انہیں اپنے مفاد کے لئے ملازمتیں دیں اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز کیا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی اردو زبان لائے تھے اور مقامی لوگوں کے میل میلاپ سے جموں و کشمیر میں اردو کی ترویج کی سبیل نکل آئی۔ اردو زبان کے توسط سے ہی ریاست کی مختلف اور متعدد لسانی اکائیوں کے درمیان تہذیبی، سماجی اور سیاسی رشتوں کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور اردو زبان سے جموں و کشمیر کی عوام کا بے حد جذباتی رشتہ ہے۔

اکائی نمبر 5: اُردو زبان وادب مہاراجہ گُلاب سنگھ کی حکومت میں (1846-1857)

۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں مہاراجہ گُلاب سنگھ کو عہد نامہ امرتسر کی رو سے انگریزوں نے 75 لاکھ روپے کے عوض کشمیر ان کے حوالے کر دیا (بعض کاغذات پر یہ رقم 68 لاکھ روپے لکھی گئی ہے) چناں چہ ۱۸۴۶ء میں ڈوگرہ حکومت کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے اور مہاراجہ گُلاب سنگھ پہلے ڈوگرہ حکمران بنتے ہیں۔ اِس سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں سکھوں کی حکومت قائم تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد گُلاب سنگھ پنجاب اور جموں کے سب سے زیادہ طاقت ور حکمران بن کر اُبھرے۔ اُنھوں نے اپنی سلطنت کی حدود کو اسکردو، لداخ، کشتواڑ، ضلع جہلم اور روالپنڈی کے قریب تک پہنچا دیا۔ مہاراجہ کے عہد میں ریاست کی دفتری اور درباری زبان فارسی تھی۔ لیکن جموں میں ڈوگری زبان کا عام چلن تھا۔ ڈوگری لسانی اعتبار سے چوں کہ پنجابی اور اُردو کے زیادہ قریب ہے اس لیے جب مہاراجہ نے ہندوستان سے سیاسی اور ثقافتی تعلقات استوار کیے تو اس زبان نے جلد ہی اُردو کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیے۔

گُلاب سنگھ کے عہد میں اگرچہ تہذیبی اور ادبی زندگی میں زیادہ ترقی نہیں ہوئی تاہم جموں اور خاص طور پر کشمیر میں جو فارسی لکھنے والے موجود تھے، اُنھیں اُردو سے بھی واسطہ پڑنے لگا جو اُس وقت تک پنجاب اور ہندوستان کے دُوسرے علاقوں میں ایک مضبوط قلعہ بنا چکی تھی۔ ولی، میر، غالب، ذوق، ناسخ، آتش، انیس اور دبیر شاعری کے حوالے سے اِس زبان کی آبیاری کر چکے تھے اور میر امن، حیدری اور سرور وغیرہ نئی نثر کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور میں اُردو کی اشاعت اور مقبولیت میں موسیقی نے بھی نمایاں رول ادا کیا۔ موسیقی عوامی سطح پر پسند کی جاتی تھی۔ پہاڑی سارنگی نواز اُردو غزلیں اور گیت کو عوام کو سنانے لگے۔ جموں میں اور کسی حد تک کشمیر میں بھی راس لیلا اور رام لیلا مقبول ہونے لگی۔ راس لیلا اور رام لیلا کرنے والے ہندوستان کے مختلف شہروں میں

گھومتے پھرتے جموں وکشمیر میں بھی آتے تھے اور راس لیلا اور رام لیلا دکھاتے تھے اور ان کے گانے خاص طور پر لوگوں کی زبان زد ہو گئے۔ اِسی دور میں اُن گیتوں اور غزلوں کے ٹکڑوں کو کشمیری موسیقی میں بھی پیوست ہونے کا موقعہ ملا۔ کشمیری بھانڈ جو اپنے کرتب اور فن میں پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکے تھے کشمیر میں بھی ان کے گائے ہوئے گیتوں کو پسند کیا جانے لگا۔ مہاراجہ کے زمانے میں ہی قوالی کا ذوق بھی پھیلنے لگا۔ یہ قوال اُردو غزلیں گاتے تھے۔ مہاراجہ گُلاب سنگھ نے برسرِ اقتدار آنے کے دُوسرے سال ڈوگری اور فارسی کی طباعت کے لیے ''ودیا پرکاش'' پریس بھی قائم کیا جس میں سرکاری فرامین، ڈاک کے ٹکٹ اور قانون کی کتابیں چھاپی جانے لگیں۔ مہاراجہ گُلاب سنگھ کے آخری عہد میں زیادہ تر سرکاری کاروائیوں کی نقلیں فارسی میں ہی ہیں لیکن کچھ اِن میں سے اُردو میں بھی ہیں۔ یہ ساری کاروائیاں ایک کتابچے کی صورت میں بھی سامنے آئیں جس کا مخطوطہ اب بھی مہاراجہ کرن سنگھ کے پاس محفوظ ہے۔ اِن کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اِسی مخطوطے میں ایک رسالہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ ریاست میں چائے کی کاشت سے متعلق ہے۔ مہاراجہ چائے کی کاشت کو جموں میں فروغ دینا چاہتا تھا۔ اور اِس سلسلے میں اُنھوں نے اپنے ایک مُلازم لالہ بوٹامل کو کانگڑہ بھیجا کہ وہ پتا کرے کہ چائے کی کاشت کن طریقوں اور اصولوں سے کی جاتی ہے۔ بوٹامل نے کانگڑہ کے ڈپٹی کمشنر کو جو رپورٹ پیش کی وہ اُردو میں ہی تھی۔ لالہ بوٹامل کے مطابق چائے کی کاشت کے بارے میں اُنھیں ایک سنسکرت مخطوطہ بھی دستیاب ہوا تھا جس کا ترجمہ اُنھوں نے اُردو میں کیا۔ یہ ترجمہ بھی مخطوطے میں شامل ہے اور ہدایتِ کاشتِ چائے کے نام سے موسوم ہے۔

جب مہاراجہ گُلاب سنگھ نے حکومت سنبھالی تو فارسی عدالتی زبان بنی اور یہ سب کچھ مغل کورٹ کے زیرِ اثر ہوا۔ مغلیہ سلطنت کا اثر اتنا زیادہ ہوا کہ مہاراجہ گُلاب سنگھ نے نہ صرف فارسی کو درباری زبان بنایا بلکہ اُن کے رسم ورواج اور مہذبی تہواروں کو بھی اُسی طرح منانا شروع کیا کہ جس طرح مغل مناتے تھے۔ جو میلے مغلیہ دربار سے وابستہ تھے اُنھیں یہاں بھی منانا جانے لگا اور اِس سلسلے میں ''نوروز'' اور ''پھول والوں کی سیر'' کا میلہ جو کہ مغلیہ دربار کا خاصّہ تھا، یہاں بھی تھوڑی ترمیم کے ساتھ منایا جانے لگا۔ تیسرا میلہ ''سیر'' بھی بسنت میں منایا جانے لگا۔ مغلوں کے دربار کی اسی نقل

نے اُردو کے لیے یہاں راہیں ہموار کرنی شروع کیں جو پہلے سے ہی مُلک کے دُوسرے حصّوں میں مضبوطی کے ساتھ اُبھر رہی تھی۔

اگر چہ مہاراجہ گُلاب سنگھ نے اپنے عہد حکومت میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا تاہم اس عہد میں یہ زبان عوام میں مقبول ہوئی اور نتیجہ کے طور پر اُنیسویں صدی کے پانچویں دہے تک پہنچتے پہنچتے اُردو نے اِس قدر مقبولیت حاصل کی کہ اب عدالتوں، مال وغیرہ محکموں میں اِس کا استعمال ہونے لگا۔

اِسی دور میں غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کی آوازیں بھی ہمارے ہاں (جموں وکشمیر میں) آنا شروع ہوئیں۔ مہاراجہ گُلاب سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں عنانِ حکومت اپنے بیٹے رنبیر سنگھ کو سونپ دی اور خود کشمیر میں گوشہ نشین ہوئے۔ یہیں اُن کا اِنتقال ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

مہاراجہ گُلاب سنگھ کے دورِ حکومت میں پنڈت ٹھاکر داس رازداں نامیؔ، پنڈت راج، پنڈت مست رام تھاپا، پنڈت گوپال کول غیوریؔ وغیرہ کا شُمار مشہور فارسی شعرا میں ہوتا تھا۔ مرزا احمد اور ان کے فرزند میرزا سیف الدین نے فارسی انشا پردازی کو فروغ دیا۔ اُردو شعر وادب بھی اِسی دوران پروان چڑھتا ہے۔ اور لوگ شاعری کی طرف متوجہ ہونے لگتے ہیں۔ اِس دور کی چند غزلیں جو دستیاب ہوئی ہیں۔ اُن کے چند اشعار یوں ہیں:۔

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں
قبر بُلبُل کی بنے گُلزار میں

اب لڑکپن چھوڑیے ،ظالم شباب آنے کو ہے
ان خیالوں کے کٹوروں میں گُلاب آنے کو ہے

اکائی نمبر 6: مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد (1857-1887) اور اُردو زبان وادب

مہاراجہ گُلاب سنگھ نے جب نظم ونسق سے کنارہ کشی اختیار کی تو رنبیر سنگھ نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اپنے والد کے دورِ حکومت میں وہ مختلف محکموں سے وابستہ رہ چکے تھے۔ گُلاب سنگھ نے اپنے انتقال تک رنبیر سنگھ کو اہم مشورے بھی دیے۔ اِس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یہاں نظم ونسق میں بہت سی اصلاحات کر کے اُسے برطانوی ہند کے معیار پر لانے کی کوشش کی۔ اِس نئے نظم ونسق میں اِظہار وابلاغ کا وسیلہ اُردو زبان تھی جو اُس وقت تک برطانوی ہند میں فارسی کی جگہ لے چکی تھی، اور پورے ہندوستان میں عوامی زبان کے طور پر قبول کر لی گئی تھی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ علم وادب کا خود بھی شیدائی تھا۔ ریاستی عوام کو نئی تعلیم سے روشناس کرانا چاہتا تھا خاص طور سے ہندو مذہب کو فروغ دینے کے علاوہ سنسکرت زبان اور دیگر علوم وفنون سے بھی مہاراجہ کو گہرا شغف تھا۔ اِسی مقصد کے پیشِ نظر اُنھوں نے کئی مندر بنوائے اور پاٹھ شالائیں قائم کیں۔ جموں میں بنوایا ہوا شری رگھوناتھ مندر اور سنسکرتی پاٹھ شالہ اِس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ رنبیر سنگھ کے دِل میں ہندو مذہب اور سنسکرت کے لیے کتنا احترام تھا۔ سنسکرت کی اِس پاٹھ شالہ میں جو مہاودیالیہ کے نام سے موسوم تھی، برہمن لڑکوں کو مُفت تعلیم دی جاتی تھی۔ پاٹھ شالہ کے ساتھ ہی اُنھوں نے رگھوناتھ مندر کے اطراف کئی اور مندر بھی بنوائے اور سنسکرت مطبوعات اور مخطوطات کا ایک بڑا کُتب خانہ بھی قائم کیا جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مخطوطات کو منگوا کر محفوظ کیا۔ جموں کی رنبیر لائبریری آج بھی موجود ہے اور علم وادب کے شیدائیوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ رنبیر سنگھ نے ایک اور کام یہ بھی کیا کہ جموں وکشمیر کے مقدس ہندو مقامات، مندروں اور تیرتھوں کا ایک جائزہ مرتب کروایا اور اُن کے تحفظ کے لیے ایک وقف بھی قائم کیا۔ جس کے قواعد وضوابط فارسی میں لکھے گئے۔

رنبیر سنگھ کے عہد میں انگریزی حکومت کے استحکام کے نتیجے کے طور پر علمی اور ادبی روایات بھی نئی راہوں پر گامزن ہوئیں۔ نیا تعلیمی نظام اور نئے علوم وفنون جو ہندوستان میں رائج ہو چکے تھے، اِس کا براہِ راست اثر ریاست پر

بھی پڑا۔ چناں چہ اِس نئے نظم ونسق کے لیے بھی نئے تعلیم یافتہ اہل کاروں کی ضرورت تھی۔ اِسی مقصد کے لیے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کرنے کے علاوہ فارسی اور عربی کے مدرسے بھی قائم کیے۔ فارسی اگرچہ اُس عہد میں درباری زبان تھی لیکن یہ نئے عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتی تھی چنانچہ اِس کام کو اُردو نے آگے بڑھانا شروع کیا۔ اب ریاست کے مدرسوں میں اُردو پڑھائی جانے لگی اور اس کا نصاب عموماً وہی ہوتا تھا جو ہندوستان کے اور علاقوں میں رائج تھا۔

مہاراجہ نے جدید علوم سے روشناس کرانے کے مقصد سے ایک دارلترجمہ بھی قائم کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے نورتن جن میں دیوان کرپارام، پنڈت صاحب رام، ڈاکٹر بخشی رام، پنڈت گنیش کول شاستری، حکیم ولی اللہ شاہ، حکیم نور الدین قادیانی، مولوی عبداللہ، مجتبہ العصر، مولوی غلام حسین طالب لکھنوی اور بابو نصر اللہ عیسائی فارسی میں بھی لکھتے تھے اور اُردو زبان بولنے کے علاوہ اِس میں لکھتے بھی تھے۔

اِن علما میں قابلِ ذکر نام دیوان کرپارام کا ہے۔ اُنھیں فارسی پر اچھا عبور حاصل تھا اور فارسی میں چار پانچ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ''گُلاب نامہ'' اور ''تاریخِ کشمیر'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ''گُلاب نامہ'' مہاراجہ گُلاب سنگھ کے عہد تک کی تاریخ ہے۔

جب شمس العما مولانا محمد حسین آزاد کی ''دربارِ اکبری'' شائع ہوئی تو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُنھیں ڈوگرہ خاندان کی تاریخ لکھنے کی بھی دعوت دی اور اس کے شایانِ شان صلہ کی پیش کش بھی کی لیکن آزاد نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

رنبیر سنگھ مغلیہ دربار کی طرح ہی اپنے دربار میں بھی دربار کی شان وشوکت اور رعب داب کی روایت قائم کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے اُنھوں نے جموں وکشمیر کے باہر سے نقیبوں کو بلوا کر دربار میں ملازم رکھا۔ یہ نقیب دلی سے آئے تھے اور مغلیہ دربار کی روایت سے واقف تھے۔ چناں چہ جب دربار منعقد ہوتا تو یہ نقیب مہاراجہ کی آمد پر مغلیہ دربار کے انداز میں اِس کا اعلان کرتے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی یہ ساری دِلچسپیاں، ریاست میں اُردو کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اِن میں سب سے اہم کارنامہ اُن کا قائم کیا ہوا دارالترجمہ تھا جو مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں اور خاص طور پر اُردو میں منتقل کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔ اِس کے تحت بہت ساری کتابیں اُردو اور دُوسری زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔ اِس کے ناظم پنڈت گوبند کول تھے اور مولانا عزیز الدین مفتی اِس کے صدر تھے۔ اِن کے فرزند مفتی اعظم محمد شریف الدین بھی مترجمین میں شامل تھے۔ اُنھوں نے ''اخوان الصفا'' کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُن کی مدد سے ایک پنڈت نے سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کتابوں کو چھپوانے کے لیے ایک چھاپہ خانہ ''بدیا بلاس'' پریس کے نام سے کھولا۔ اِس میں اُردو، فارسی اور دیوناگری رسم خط کی کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔ اُردو میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں وہ زیادہ تر انگریزی سے ہوئیں۔ اِن میں علم اور طب سے متعلق زیادہ کتابیں ہیں۔ اِسی زمانے میں سرسید تحریک کے تحت بھی مختلف علوم وفنون سے متعلق انگریزی کتابوں کے ترجمے بڑی تعداد میں ہو رہے تھے اور اُردو نظم ونثر میں نئی اضاف سامنے آ رہی تھیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے علما بابو نصر اللہ عیسائی کے ڈاکٹر جان اِمن کی تصنیف Kashmir Hand Book کا ترجمہ اُردو میں ''تاریخِ رہنمائے کشمیر'' کے نام سے کیا۔ یہ کام اُنھوں نے مہاراجہ کے حُکم پر ۱۸۷۴ء میں کیا۔

رنبیر سنگھ کے اِس دارالترجمہ کے بارے میں نظم ونسق کی کچھ رپورٹوں سے جو اُردو میں چھپتی تھیں، تھوڑی بہت تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً 83-1882 کی ایک رپورٹ میں یوں درج ہے:

> ''سالِ حال کوئی کتاب جو انگریزی سے سنسکرت اور
> سنسکرت سے عربی اور عربی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے،
> ختم نہیں ہوئیں۔''

اِس دارالترجمہ سے ہٹ کر بھی ریاست میں رنبیر سنگھ کے عہد میں علمی اور ادبی کام ہوتا رہا۔ ان میں سرکار کی جانب سے جو کام ہوا، ان میں ایک اہم رسالہ قابلِ ذکر ہے جو ''پیداوار اور جانورانِ لداخ'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ رسالہ وزارتِ لداخ ریاست جموں وکشمیر کی جانب سے ۱۸۸۵ء میں مرتب ہوا۔ اسی نوعیت کی ایک اور اہم دستاویز مہتہ شیر سنگھ کا سفر نامہ ہے جو ۶۷۔۱۹۶۶ء میں مرتب ہوا۔ مہتہ شیر سنگھ رنبیر سنگھ کی حکومت میں ملازم تھا رنبیر سنگھ کو ریاست کی تجارت کو فروغ دینے کا بہت خیال تھا۔ اِس لیے اُنھوں نے مہتہ شیر سنگھ کو ریاست کے پڑوسی ملکوں کے اہم مقامات کا سفر اختیار کرنے اور راستوں کی کیفیت مرتب کرنے پر معمور کیا تھا۔ مہتہ شہر سنگھ نے ۱۸۶۷ء میں کابل، بلخ اور بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اُنھوں نے اِس سفر کی پوری روداد لکھی جو سفر نامہ سے موسوم ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں کئی اچھے شاعر اور انشا پرداز بھی اُبھر کر سامنے آئے جن میں پنڈت دیوان شیو ناتھ کول، پنڈت نندرام پرمانند، بلبل کاشمیری، پنڈت واسودیو جی، پنڈت لچھمن نارائین بھان، سید محمد انور شاہ، رسول میر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ہی ریاست کی پہلی ادبی انجمن ''بدیا بلاس سبھا'' قائم کی جس کے جلسوں میں سنسکرت، فارسی، عربی، اُردو، ہندی اور ڈوگری زبان کے دانشور شرکت کرتے تھے۔ اِس کی ہفتہ وار نشستوں کی صدارت مہاراجہ خود کرتا تھا اور اس ادبی انجمن کی کاروائیوں میں دِل چسپی لیتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اِس انجمن نے صوبہ جموں میں ادبی ماحول کو بے حد تقویت پہنچائی۔ یہی نہیں مہاراجہ نے ایک ہفتہ وار اخبار ''بدیا بلاس'' بھی جاری کیا جس میں اِس انجمن کی کاروائیوں کی روداد اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں تفصیل سے چھپتی تھی۔

اکائی نمبر 7: اُردو زبان کے ادب وفروغ میں بدیابلاس سبھا اور بدیابلاس اخبار کی خدمات

ریاست میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی حکومت ۱۸۵۶ء سے ۱۸۸۵ء تک رہی۔ مہاراجہ چونکہ ادب اور آرٹ کا خود زبردست دلداہ تھا اِس لیے اُس نے اِن شعبوں کو فروغ دینے میں ذاتی دِل چسپی لی۔ مہاراجہ نے جہاں ایک طرف اپنی رعایا کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے پاٹھ شالاؤں، مدرسوں اور کالجوں کا قیام عمل میں لایا اور مختلف زبانوں کی تعلیم کا بندوبست وہی کیا۔ اُنھوں نے دُوسری زبانوں کی طرف توجہ دی اُردو کو بھی اُنھوں نے نظر انداز نہیں کیا۔ اِنہیں کے زمانے میں ۱۸۷۷ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اُنھوں نے سنسکرت، فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے علما وفضلا کو ریاست سے اور ریاست کے باہر سے بُلا کر اپنی سلطنت میں جگہ دے کر ادب اور تعلیم کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ریاست میں اُردو کے حوالے سے اِبتدائی تقریبات اُس وقت شروع ہوتی ہیں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ کی قیادت میں ادبی اور کلچرل سوسائٹی ''بدیابلاس سبھا'' کا قیام عمل میں آتا ہے۔ سبھا اگرچہ مختلف زبانوں کو فروغ دینے کے لیے عمل میں لائی گئی لیکن اُردو کے حوالے سے اس نے چند اہم کارنامے انجام دیے۔ اِس سبھا کی میٹنگوں میں سنسکرت، ہندی، فارسی، عربی اور ڈوگری زبان کے دانشوروں کے علاوہ اُردو زبان کے دانشور بھی حصّہ لیتے تھے۔ سبھا کی ہفتہ وار نشستیں ہر وِیروار کو مہاراجہ ہری سنگھ کی ہی صدارت میں منعقد ہوتی تھیں۔ مہاراجہ کا خود اِن نشستوں میں شامل ہونا اُردو کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ اُن کی سرپرستی میں دُوسری زبانوں کی بہت سی کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا گیا۔ جو دانشور اِس سوسائٹی یا سبھا کی میٹنگوں میں اکثر شرکت کرتے رہے اور بحث ومباحثہ میں حصّہ لیتے رہے۔ اُن میں جے پور کے برج لال، بنگال کے رام بھون بھٹاچاریہ، بنارس کے پنڈت بنکٹ رام شاستری، لالہ گلاب رائے، غلام غوث ہوشیار پوری، دیوان کرپارام اور کیف الدین نور وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مہاراجہ نے ذاتی طور پر اِس سبھا کے روز بروز کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور علمی اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں دانشوروں کو ہر قسم کی سہولیت فراہم کرتے رہے۔ اِس سبھا کی مجلسوں میں مقامی زبانوں کو تو فروغ ملا ہی لیکن اُردوٗ زبان کو روزمرہ کے کام میں برتا جانے لگا تھا، جو ''بدیا بلاس سبھا'' کی وجہ سے اور بھی مشہور ہوئی۔ یہی نہیں مہاراجہ نے ۱۸۵۸ء میں ہی ''بدیا بلاس'' نام سے ایک پریس قائم کیا جس کا مقصد اگر چہ دارلترجمہ کی کتابوں کو چھاپنا تھا لیکن اُنھوں نے اِس پریس سے ''بدیا بلاس'' نام کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی شائع کرنا شروع کیا۔ یہ اخبار ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ اِس کے پہلے مدیر پنڈت گوپی ناتھ گوٹو تھے۔ یہ اخبار اُردوٗ اور دیوناگری دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ اِس کے نامہ نِگار اکثر ہندوستان کے بڑے شہروں سے خبریں بھیجتے تھے جو اِس اخبار میں دونوں زبانوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ''بدیا بلاس سبھا'' کی میٹنگوں کی کاروائیاں بھی اِس کے صفحات کی زینت بنتی تھیں۔ اِس میں بعض خبریں ایسی بھی ہوتی تھیں جو دِل چسپی سے بھرپور ہوتی تھیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اِس اخبار سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''اخبار کی نوعیت کی یہ پہلی چیز تھی جو ریاست سے شائع ہونے لگی تھی..... اخبار میں کچھ دِل چسپی کی خبریں بھی شامل ہوتی تھیں۔ مثلاً اِسی اخبار میں 'خدا کی قدرت' عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی جس کا انداز بیان یوں ہے۔
>
> ''نامہ نِگار منیرا کبر بدایوں سے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک غریب آدمی کی عورت حاملہ تھی اور اُس کے رہنے کا مکان پرانا اور بوسیدہ تھا۔ کثرتِ بارش سے ٹپکنے لگا۔ اُس کے خاوند نے چھت پر مٹی وغیرہ ڈال کر دُرست کیا لیکن اُسی حالت میں بارش کا یہ زور ہوا کہ مکان کی ایک دیوار گر گئی اور اِسی حالت میں عورت کے بچّہ پیدا ہوا۔ کیا شانِ الٰہی دیکھئے کہ وہ بچّہ اور اُس کی ماں بچ گئی۔''

مختصراً ''بدیا بلاس سبھا'' اور بدیا بلاس'' اخبار نے صوبہ جموں میں دُوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردوٗ زبان کے فروغ کے لیے بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ پروفیسر ظہورالدین اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"The first literary organisation which came into existance here was the Bidya Bilas Sabha' set by the Maharaja Ranbir Singh to give necessary importance to the languages prevalent in the region, particularly Urdu, Percian, Dogri and Sanskrit. It also published a weekly news paper the "Bidya Bilas" in which proceedings of the meetings of the Sabha were regularly published. This organisation rendered a marvellous service to the cause of theUrdu langyuage too.

''بدیا بلاس'' کی پوری فائل اِس وقت برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے جسے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس اخبار کا لکھنے کا انداز اور معیار کیسا تھا۔ اِس اخبار میں جیسا کہ پہلے کہا جاچُکا ہے کہ ''بدیا بلاس سبھا'' کی میٹنگوں کی کاروائیوں کو بھی اُردوٗ اور ہندی میں چھاپا جاتا تھا۔ اِس اخبار میں سبھا کے ممبران کے ادبی کاموں کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کے علاوہ ان کے کاموں پر تبصرہ بھی کیا جاتا تھا۔ اس کا ایڈیٹوریل ضروری ادبی کاموں سے متعلق ہوتا تھا اور آئندہ شروع کیے جانے والے ادبی کارناموں کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا تھا۔ اِس طرح سے اِس اخبار نے یہاں کے لوگوں میں کلچرل اور ادبی ذوق پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ اخبار ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا۔ اخبار کہنے کے بجائے اِسے ادبی میگزین کہنا درست ہوگا کیوں کہ اِس کا زیادہ تعلق ادب سے ہی تھا۔

''بدیا بلاس سبھا'' سے باہر کے کچھ علما وفضلا جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے نے بھی کچھ اہم کارنامے انجام دیے۔ ان کی وجہ سے کئی ادبی اور مذہبی شہ پاروں کے ترجمے اُردو، ہندی، ڈوگری اور پنجابی میں ہوئے۔ اُردو کے حوالے سے جو کام ان لوگوں نے کیا اُن میں سے چند یوں ہیں:

الف لیلہٰ: مشہور عربی داستان الف لیلہٰ کو لکھنو کے مُفتی عبدالکریم نے ۱۸۴۲ء میں ترجمہ کیا۔

دیوانِ سوداؔ: مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کہنے پر دیوانِ سوداؔ کی کتابت گجرات کے محمد عثمان نے ۱۸۵۶ء میں کی۔ یہ کام ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

کلیات محمد سودا: مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم پر ہی محمد عثمان نے ۱۸۶۱ء میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کے پورے کلیات کی کتابت کی۔

رسالہ مورچہ نما: یہ انگریزی کے انجنیر ٹنگ سے متعلق کام کا ترجمہ ہے جسے بخشی رام پنڈت نے ۱۸۶۸ء میں اُردو میں منتقل کیا۔ اِس کے صفحات کی تعداد ۱۶۱ ہے۔

تحریک رہنمائے کشمیر: یہ انگریزی کی کتاب Kashmir Handbook کا اُردو ترجمہ ہے جسے مہاراجہ کے حُکم پر ۱۸۷۴ء میں بابو نصر اللہ نے اُردو میں کیا۔ اِس کے صفحات کی تعداد ۱۴۳ ہے۔

سفر نامہ مہتہ شیر سنگھ: اِس سفر نامے کو مہتہ شیر سنگھ نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم کے مطابق ۱۸۶۶ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۹۶ء میں مکمل کیا۔ اِس کی کتابت مشہور کاتب مولوی غلام مصطفٰے نے کی۔

احوالِ ملک لداخ: یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی۔ لداخ کے لوگوں کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر لکھی گئی ۹۲

صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس پر نہ ہی کاتب کا نام لکھا ہے اور نہ ہی لکھنے والے کا۔

ترجمہ تحریکِ اِنگلستان: یہ اِنگلستان کی تاریخ کا اُردو ترجمہ ہے۔ اِس کے صفحات کی تعداد ۲۰۸ ہے۔ چھپنے کی تاریخ اور مصنف کے علاوہ کاتب کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے۔

بھگوت گیتا اُردو: بھگوت گیتا کا اُردو ترجمہ ہے جو ۳۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ نہ ہی ترجمہ نِگار کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی سنِ اشاعت کا۔ اِس کی کتاب کس نے کی، اس کا بھی پتہ نہیں چلتا۔

مثنوی بدر منیر: یہ میر حسن کی مشہور مثنوی بدر منیر ہے جس کی کتابت اُردو میں کی گئی۔ کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

مندرجہ بالا جتنے بھی کاموں کا ذکر ہو چکا ہے، یہ سارے کام اس وقت کشمیر یونی ورسٹی کی اس لائبریری میں محضوظ ہیں جہاں عربی اور فارسی کے مخطوطات رکھے ہوئے ہیں۔

اکائی نمبر 8: مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا عہد اور اُردو زبان

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد 1885ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی۔ پرتاپ سنگھ کے عہد تک اُردو زبان کا چلن عام ہو چکا تھا۔ عوام کی ایک بڑی تعداد اُردو لکھنے پڑھنے کی جانب راغب ہو چکی تھی اور اُردو زبان اُن کے اظہار کا ایک کامیاب ذریعہ بن چکی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے سیاسی حکمت عملی اور اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر ریاست کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کو ایک لسانی دائرے میں لانے کے لیے اُردو کو 1889ء میں سرکاری درجہ عطا کیا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی دور اندیشی اور دانش مندی یہ علامت ہے کہ جس نے الگ الگ بولیوں کے خطوں کے عوام کو ایک زبان کی لڑی میں پرو دیا۔ مہاراجہ کا یہ ایسا کارنامہ ہے جسے جموں و کشمیر کی سیاسی اور اُردو ادبی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جانا چاہیئے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہدِ حکومت میں ایک سے ایک نامور ادیب ریاست جموں و کشمیر کو حاصل ہوئے۔ اسی دور میں ہرگوپال خستہ کے برادرِ اصغر سالک رام سالک دوسرے نثر نگار رہے ہیں۔ سالک بہت بڑے اُردو دوست ادیب تھے۔ ان کا ادبی ذوق لکھنو اور لاہور کی ادبی محفلوں میں نکھرا اور معتبر بنا تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے تک ''اودھ اخبار'' میں اپنے مضامین تحریر کرتے رہے ہیں۔ اپنے برادر کی مدد سے انہوں نے بھی ایک ہفت روزہ پرچہ ''خیر خواہِ کشمیر'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ اسی زمانے میں جب عیسائی دھرم کی تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے روکنے کے لیے مختلف مذاہب کے عالموں میں ایک ذہنی بیداری ہوئی۔ اسی ماحول میں سالگ رام سالک کشمیر وارد ہوئے اور یہاں پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی نگرانی میں سناتن دھرم کی تشکیل ہوئی۔ جس کے منشور کے تحت عیسائیت کے خلاف کئی کتابچے تیار کئے گئے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے سالک سے 'مورتی منڈن''۔ ''دھرم اُپدیش'' اور ''شاستر ارتھ'' جیسی دھارمک کتابیں ترتیب دلائیں۔ علاوہ اس کے سالک نے ''لغات اُردو'' اور ''محاورات اُردو'' کے نام سے بھی چند کتابیں مرتب کیں۔ ادبی کتابوں کے

علاوہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے حکم کے مطابق سالک نے ''قانونی تعزیراتِ جموں وکشمیر'' کی مسبوط شرح ''ضابطۂ دیوانی'' اور کئی قانونی دستاویزات کو اُردو میں لکھا۔ان کے خالص ادبی کارناموں میں ''کنجیۂ فطرت''۔''داستانِ جگت روپ'' اور ''تحفۂ سالک'' قابل ذکر ہیں۔

بعد میں یہی سلسلہ آگے بڑھا اور اُنیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں لاہور، پنجاب، دہلی ان کے علاوہ دوسرے شہروں سے ریاست جموں وکشمیر کا رابطہ اخبارات کے وسیلے سے ہوا۔ یہ اخبار اکثر بیشتر یہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل اپنے اخباری کالموں میں جگہ دیتے تھے۔چناں چہ یہاں کی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے ونکھارنے میں اُردو صحافت کا ایک نمایاں کردار ہے۔صحافت کے میدان میں محمد دین فوق کا نام سرِفہرست ہے کہ جنھوں نے اپنی جدوجہد سے کشمیر سے متعدد اخبارات جاری کئے۔محمد دین فوق اپنے زمانے کے مایہ ناز عالم تھے۔وہ ایک کثیرالجہات ادبی شخصیت کے مالک بھی تھے۔ان کے علاوہ صحافتی میدان میں لالہ ملک راج صراف جموں کے وہ پہلے صحافی تھے جن کی اُردو دوستی کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے 1924ء میں جموں سے پہلا اخبار ''رنبیر'' جاری کیا اس اخبار کی اشاعت اُردو نثر ادب کے فروغ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔اس اخبار کے ذریعے اُردو نثر نگاروں کی ایک نئی کھیپ اُبھر کر سامنے آئی۔جن میں مولوی زین العابدین، جیالال کلم، سالگ رام کول، مولوی عبداللہ وکیل، کشپ بندھو، پریم ناتھ بزاز، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، نشاط کشتواڑی، دیا کرشن گردش، غلام حیدر چشتی، تاراچند، قیس شیروانی وغیرہ کافی اہم ہیں۔

صوبہ جموں میں اِبتدائی ادبی تخلیقات

جب دلی میں اِسلام پھیلا اور مغل کورٹ کا تسلط قائم ہوا تو صوبہ جموں میں اِس کا براہِ راست اثر پڑا جس کی وجہ

سے عربی اور فارسی کے کئی مراکز یہاں وجود میں آئے۔ اِن میں کشتواڑ اور پونچھ کے ادبی مراکز اہمیت کے حامل ہیں۔ اِن مراکز نے پڑھنے لکھنے کا اچھا خاصا ماحول پیدا کیا۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ چوں کہ اُردوٗ اُس وقت مقبول ہو رہی تھی، لوگوں نے اس کے فن پاروں کو بھی پڑھنا شروع کیا۔ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی اِن زبانوں کی مذہبی اور ادبی تخلیقات کو پڑھنا شروع کیا۔ چوں کہ اُس زمانے میں نہ تو پریس موجود تھا اور نہ چھپا ہوا زیادہ مواد اِس لیے بعض لوگوں نے اپنی مذہبی اور ادبی پیاس بجھانے کے لیے اِن زبانوں کے مشہور کاموں کو ہاتھ سے لکھ کر اُنھیں محفوظ کرنا شروع کیا۔ اِس کی وجہ سے کئی افراد کے ذاتی کُتب خانے وجود میں آئے۔ یہاں کے مقامی کاتبوں نے بھی اِن تحریروں کو لکھا۔ سترھویں صدی میں یہ ساری زبانیں لوگوں میں مقبول ہو چکی تھیں۔ جن لوگوں کے اپنے ذاتی کُتب خانے ہیں اور جن میں اِبتدائی ادبی تخلیقات محفوظ ہیں، اُن میں سے بعض کے اسمائے گرامی یوں ہیں:

۱: شری عبدالجید خان مسجد محلّہ، کشتواڑ

۲: حکیم سیّد شاہ کشتواڑ

۳: قاضی یعقوب شاہ کشتواڑ

۴: مولوی بہاؤالدین کشتواڑ

۵: عشرت کاشمیری کشتواڑ

۶: شیخ غلام علی کشتواڑ

۷: قاضی نجیب الدین کشتواڑ

۸: شری محمود الحسن پونچھ

۹: شری دیانند کپور پونچھ

۱۰: شری دینا ناتھ رفیق پونچھ

اِسی طرح کی بہت سی ذاتی لائبریریاں ٹھاٹھری، ڈوڈہ، اور تھنہ منڈی میں بھی وجود میں آئیں جواب بھی محفوظ ہیں۔ اِن ذاتی کُتب خانوں میں ہمیں سترھویں صدی کے پانچویں دہے کے بعد کی تخلیقات ملتی ہیں۔ بعض تخلیقات کی فہرست یوں ہے:

۱: کتابِ شرح: اِس کتاب کی کتابت 1673ء میں عربی میں احسان اللہ نے کی۔ اِس کا مخطوطہ کشتواڑ کے قاضی نیاز اللہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۲: کتابلمندب: یہ کتاب اورنگ زیب کے کہنے پر 1679ء میں گنگا رام نے لکھی۔ اِس میں فارسی کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ اِس کا مخطوطہ نیاز اللہ صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

۳: کتاب بحرالقلب: حضرت محمدؐ کی زندگی سے متعلق اِس کتاب کی کتابت 98-1697ء میں ہوئی۔ کاتب کا نام کتاب پر نہیں لکھا ہے۔ یہ کتاب بھی کشتواڑ میں قاضی نیاز اللہ کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

۴: کتاب مشعلِ عربیا: یہ کتاب بھی 1700ء میں کتابت ہوئی اور قاضی نیاز اللہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۵: عربی اور فارسی زبانوں پر مشتمل رسالہ بھی قاضی نیاز اللہ کی لائبریری میں ملتا ہے۔ اِس کی کتابت 1721ء میں ہوئی۔ مذہبی معاملوں سے متعلق اہم نکات پر مبنی ہیں۔

٦: دیوانِ صاحب: مارچ 1735ء میں اس کی کتابت ہوئی۔ حکیم پیر سیّد صاحب کے ذاتی کُتب خانے میں موجود ہے۔

۷: عربی میں ایک کتاب 1776ء میں کتابت ہوئی اور کشتواڑ میں یہ حکیم پیر سیّد صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ کتاب مذہبی معاملات پر لکھی گئی ہے۔

۸: 1795-96 ء میں متبرک قرآن کو کشمیر کے کھیرابابا نے نقل مرتب کیا۔ یہ بھی قاضی نیاز اللہ کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

۹: کتاب زُلیخا، فارسی کے اِس قصّے کو کشتواڑ کے مشہور و معروف کاتب سیف اللہ صاحب نے 1796ء میں لکھا۔ کشتواڑ میں یہ مولوی بہاؤالدین کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

۱۰: تکبیر الغت: فارسی کی اِس لغت کی کتابت جناب خضر اللہ نے 1775ء میں کی۔ یہ بھی قاضی نیاز اللہ کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

مندرجہ بالا کُتب خانے میں اِس کے علاوہ بھی عربی اور فارسی کی چند ایسی تصانیف موجود ہیں جو اٹھاریوں اور اُنیسویں صدی میں کتابت ہوئیں۔ البتہ اِن میں سے کوئی بھی اُردو میں نہیں ہے۔ قصّہ سیف الملوک جو 1840ء میں کتابت ہوا، اِس وقت اِس کا نسخہ جناب ٹیک چند نندر یٹائر ماسٹر بسوہلی کے پاس محفوظ ہے۔ اُنیسویں صدی میں جتنے بھی رُجحانات مُلکی سطح پر ہوتے رہے۔ اُن کا براہِ راست اثر صوبہ جموں پر پڑا خصوصاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے زیرِ اثر داستانوں اور دُوسرے ادبی تراجم شائع کرنے کا جو سِلسِلہ شروع ہوا اُس کے تحت ریاست جموں و کشمیر میں بھی داستانوں کے فروغ کو اہمیت دی گئی۔ اُس زمانے میں یہاں چوں کہ طباعت کی سہولیات میسر نہ تھیں لہذا ادبی ذوق کی تسکین کے لیے لوگ خود قلمی نقلیں تیار کر کے تقسیم کرنے لگے۔ اِس طرح کی کئی نقلیں اِس وقت بھی لوگوں کی ذاتی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اِسی طرح علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر جو کچھ ملکی سطح پر ہوا اور اُردو میں نئی اصناف کو متعارف کرانے کا جو کام ملکی سطح پر کیا گیا اُس کے اثرات بھی ریاست پر مرتب ہوئے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی قیادت میں ریاست کی پہلی سرکاری ادبی انجمن ''بدیا بلاس'' سبھا کے تحت ایک طرف تو تالیف و ترجمے کا کام کیا گیا دُوسری طرف نئی اصناف کو بھی متعارف کرانے کی کوشش کی گئی۔ خصوصاً نئی اصناف کے تحت ریاست سے باہر جو اہم فن پارے تخلیق ہوئے اُنھیں ریاست کی مختلف علاقائی زبانوں خصوصاً ڈوگری اور پنجابی میں ترجمہ کر کے خاص و عام تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

قدیم دلی کالج کے تحت Translation Society قائم کر کے جو کام مُلکی سطح پر کیا گیا اُسی طرح کا کام ''بدیا بلاس'' سبھا نے بھی کیا۔ یہ سبھا ۱۸۶۵ء سے اُنیسویں صدی کے آخر تک کام کرتی رہی جسے چلانے کے لیے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُردو، فارسی، ہندی اور سنسکرت کے اسکالر مُلک کے مختلف مراکز سے مدعو کر کے اُس کے ساتھ وابستہ کیے۔ اِس سبھا کے تحت جِتنا کام ہوا اُسے خاص و عام تک پہنچانے کے لیے ''بدیا بلاس'' کے نام سے ہی ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو ہندی اور اُردو میں بیک وقت شائع ہوتا تھا۔ اِس میں اِس انجمن کی ساری سرگرمیاں شائع کی جاتی تھیں۔

اُنیسویں صدی کی اِبتدا میں چوں کہ مہاراجہ یہاں کوئی بھی اخبار جاری کرنے کی اِجازت نہیں دیتا تھا اِس لیے بعض کشمیری مُلک کے دُوسرے حصّوں سے اخبارات جاری کرتے ہیں۔ خاص طور پر لاہور، سیالکوٹ، امرتسر اور دہلی جیسے ادبی مراکز سے اخبار جاری کر کے ریاست میں بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُس زمانے میں مُلک کے نمایاں قلم کاروں کی جو ادبی تخلیقات چھپتی تھیں وہ ریاست میں پہنچنے لگیں اور ہماری ریاست کے عوام باہر کے اُردو قلم کاروں کی ادبی تخلیقات سے روشناس ہونے لگے۔ اُنیسویں صدی کی بعض نمایاں اِبتدائی تخلیقات جو ہمیں ملتی ہیں اور جو اِس وقت بھی بعض ذاتی لائبریریوں میں محفوظ ہیں اُن کی نشاندہی گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے:

اکائی نمبر 9: جموں کشمیر کی سرکاری زبان اردو کا تاریخی ارتقاء

ریاست جموں وکشمیر تین صوبوں پر مُشتمل ہے۔صوبہ جمّوں،صوبہ کشمیراورصوبہ لدّاخ۔صوبہ جمّوں آبادی کے لحاظ سے ریاست کا پہلا بڑا صوبہ ہے۔جمّوں اس صوبہ کا صرف مرکزی شہر ہی نہیں بلکہ ریاست کی سرمائی راجدھانی بھی ہے۔صوبہ جمّوں علمی،ادبی،سیاسی،سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ریاست جموں وکشمیر مُلک کی واحد ریاست ہے جہاں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔یہ ریاست کے تینوں صوبوں میں رابطے کی زبان ہے۔

مہاراجہ گُلاب سنگھ کے دورِحکومت (۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۶ء) میں ہمیں اُردو زبان کے استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے پہلے اُردو کے چلن کے متعلق زیادہ تفصیلی معلومات نہیں ملتیں۔بقول ایک آفیسر ''طبقاتِ الارض'' کے ماہر نے مہاراجہ کے دربار کے متعلق لکھا کہ ہندوستان سے آنے والے ملازم بلاشبہ ہندوستانی (اُردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔حالاں کہ مہاراجہ گُلاب سنگھ کے دورِحکومت میں فارسی درباری زبان تھی۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد (۱۸۵۶ء سے ۱۸۸۵ء) میں ریاست کی پہلی ادبی انجمن ''بدیابلاس'' (۱۸۶۷ء) کے قیام سے اُردو زبان وادب کو فروغ ملا۔مہاراجہ موصوف ہی کی کوششوں سے اُردو زبان اس علاقے میں تمام سرکاری اور غیر سرکاری ذمّے داریاں سنبھالنے کے قابل ہوئی۔بیسویں صدی کے آغاز ہی سے صوبہ جمّوں میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اُس وقت کے دو رسائل ''ڈوگرہ گزٹ'' (۱۹۱۱ء) اور دُوسرا ''مہاجن نیتی پتر'' (۱۹۱۲ء) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اِن میں اکثر سیاسی،سماجی،دھارمک وغیرہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ملک راج صراف صاحب نے یہاں کے شاعروں اورادیبوں کو اکٹھا کر کے جمّوں خطّے میں اُردو کی ایک انجمن ''بزمِ سخن'' جمّوں ۱۹۱۲ء میں قائم کی۔اس سے جمّوں خطّے میں اُردو زبان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔یہ ''بزمِ سخن'' بعد میں ''بزمِ ادب'' کے نام سے مشہور ہوئی۔صوبہ جمّوں کے ادیبوں، شاعروں نیز ڈرامانِگاروں نے بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے اُردو ادب کے دامن کو بہت وسیع کیا۔اُن میں محمد عُمر،نُور

الٰہی ،قیس شیروانی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔۲۰ جون ۱۹۲۴ء میں اُردو کا پہلا مکمل اخبار ''رنبیر'' منظرِ عام پر آیا۔اخبار ''رنبیر'' کے جاری ہونے سے صوبہ جمّوں میں اُردو زبان وادب کی ترقی کی رفتار تیز ہوں جن شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات اس میں شائع ہوئیں، اُن میں مبارک علی بیگ، محمد عُمر، نُور الٰہی ، پنڈت کشن سمیل پوری، قیس شیروانی، عرش صہبائی، غلام حیدر چشتی وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

محمد عُمر اور نُور الٰہی کا تعلق خطّہ جمّوں سے تھا۔ان دونوں ادیبوں نے مشترکہ طور پر کئی قابلِ قدر ادبی کارنامے انجام دیے۔ڈرامانِگاری پر اُن کی کتاب ''ناٹک ساگر'' خاص اہمیت رکھتی ہے۔صوبہ جمّوں میں اُردو کی ادبی انجمنوں کا ایک اہم رول رہا ہے۔ادبی انجمنیں لوگوں کے ادبی ذوق وشوق کا مظہر ہوتی ہیں۔ یہ انجمنیں سیمینار، ادبی کانفرنسیں، مشاعرے وغیرہ منعقد کرتی ہیں۔صوبہ جمّوں کے تمام اضلاع میں تقریباً ہر تحصیل ہیڈ کوارٹر پر ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں بزمِ ادب کشتواڑ وجود میں آئی۔ یہ بزمِ ادب اُردو نشاطؔ کشتواڑی، عشرت کاشمیری وغیرہ شاعروں اور ادیبوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔لیکن اب اس بزم میں جمود سا آ گیا ہے۔ بزمِ ادب بھدرواہ اپریل ۱۹۶۸ء میں وجود میں آئی۔اس کے ذریعے سے اس علاقے کے اہلِ سخن کو مُلک کے دیگر ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے روشناس ہونے کا موقع ملا جن میں وہاں کے مشہور شاعر رسؔا جاودانی (مرحوم) کا نام سرِ فہرست ہے۔بزم کے زیرِ اہتمام یادگاری مشاعرے، کانفرنسیں منعقد کی گئیں جن میں شامِ مہجور، یومِ اقبالؔ، شامِ رسؔا وغیرہ خصوصیت کی حامل ہیں۔ ڈوڈہ کی ''فریدیہ بزمِ ادب'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں پر چار کل ہند مشاعرے منعقد کیے گئے۔''فریدیہ بزم'' ڈوڈہ نے کتابیں بھی شائع کیں۔اُن میں ''انوارِ فریدیہ'' اور ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی ثقافتی تاریخ'' قابلِ ذکر ہیں۔ بزمِ ادب بانہال (۱۹۷۲ء)، کرشن چندر لٹریری کلب پونچھ، کرشن چندر میموریل، بزمِ ادب سرنکوٹ، انجمن فروغِ اُردو جمّوں، بزمِ ادب اُردو جمّوں، ادبی کنج جمّوں، انجمن محبّانِ اُردو جمّوں، انجمنِ ترقی اُردو (ہند) شاخ جمّوں وغیرہ بھی اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے پیش پیش رہی ہیں۔جمّوں سے شائع ہونے والے اُردو اخبار، سالنامے اور میگزین بھی خاص اہمیت رکھتے

ہیں۔ اِن میں کشمیر عظمیٰ جموں تسکین جموں قومی آواز' جموں راہِ منزل جموں پیامِ جمہور کاشتکار جموں تصویرِ جموں اور تریکوٹہ ٹائمز جمّوں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

صوبہ جمّوں کے لوگوں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔صوبہ جمّوں میں مختلف علاقائی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جمّوں میں ڈوگری، پنجابی اور گوجری، پونچھ میں پونچھی، کشتواڑ میں کشتواڑی، بھدرواہ میں بھدرواہی، اور کشمیری، ڈوڈہ میں سراجی، اور کشمیری، پاڈر میں پاڈری، پوگل میں پوگلی، راجوری میں پہاڑی اور گوجری۔ یہ علاقائی بولیاں یا زبانیں مقامی طور پر مقبول ہونے کے باوجود اس قابل نہیں کہ ریاست کو متحد رکھ سکیں۔اُردو ریاست کی واحد زبان ہے جو ریاست کی تینوں جغرافیائی اکائیوں کو متحد رکھتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں پوری ریاست کے اسکولوں اور کالجوں میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا۔اچھے تعلیم یافتہ اُساتذہ اُردو اسکولوں اور کالجوں میں تعینات کیے گئے۔مختلف سرکاری محکمہ جات میں، خاص طور پر محکمۂ تعلیم، محکمۂ جنگلات، محکمۂ پولیس، محکمۂ عدلیہ وغیرہ میں اُردو کا کافی چلن رہا۔ ۱۹۵۶ء میں ریاست کی پہلی آئین ساز اسمبلی نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اُردو کو رابطے کی زبان قرار دیا لیکن سرکاری حیثیت کے باوجود اسے بے توجہی کا شکار ہونا پڑا۔حالات کی تبدیلی کے باعث اب دفتری کام زیادہ تر انگریزی میں ہوتا ہے۔

آزادی کے تقریباً ۲۰ برس بعد تک صوبہ جمّوں میں اُردو کا خوب دور دورہ رہا۔ ہائر سکینڈری اور کالجوں کی سطح تک اُردو پڑھانے کی طرف خاص توجّہ دی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ صوبہ جمّوں کا بیوپاری طبقہ اپنی روزمرّہ گُفتگُو، اپنے حساب کتاب، لین دین میں جتنا استعمال اُردو کا کرتا تھا اُتنا شاید ہی کسی دُوسری زبان کا کرتا ہو۔سرکاری زبان کا درجہ مل جانے کے بعد ریاستی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولا سختی سے لاگو کیا۔اُردو کے ساتھ ہندی کا جاننا بھی ضروری قرار پایا۔اسی دوران پرائمری اور ہائی اسکولوں کے اساتذہ کو اُردو اور ہندی سِکھانے کے لیے ٹریننگ دی گئی۔ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں کے طلبہ کے لیے اُردو اور ہندی کی کتابیں یکساں طور پر ملتی تھیں۔تقریباً ۱۹۶۵ء کے بعد صوبہ جمّوں میں ہندی کی طرف زیادہ توجّہ دی گئی۔مرکزی حکومت کے تقریباً تمام اِداروں میں انگریزی کے ساتھ ساتھ

ہندی کو بھی عمل میں لایا گیا۔ یہاں تک کہ مرکزئی حکومت نے Competative Examination میں ہندی Medium رائج کیا۔صوبہ جمّوں میں رہنے والوں پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ چوں کہ ریاست کے اندر اور باہر مرکزی اِداروں میں نوکری حاصل کرنے کے لیے ہندی جاننا ضروری تھا اور انگریزی پہلے سے ہی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی۔لہذا نئی پیڑھی نے اُردو کے مقابلے میں ہندی کو ترجیح دی۔نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ جمّوں کے ہندو اکثریت علاقوں میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں میں ہندی اساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ جو طلبہ اُردو بطور مضمون پڑھنا چاہتے تھے وہ اُردو اساتذہ کی کمی کے باعث اس مضمون میں دِل چسپی کم لینے لگے نیز انھیں اس مضمون سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ ایسے طلبہ نے یا تو پڑھائی چھوڑ دی یا انھیں مجبوراً ہندی بحیثیت لازمی مضمون اختیار کرنا پڑا۔اس طرح سرکاری اسکولوں میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد دِن بدن کم ہونے لگی۔

صوبہ جمّوں میں اُردو درس و تدریس کی معیاری کتابوں کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔اُردو کے مقابلے میں ہندی لٹریچر زیادہ چھپتا رہا۔ ہندی کی شائع ہونے والی کتابیں نہایت سستی قیمتوں پر ملتی ہیں۔ ہندی کتابوں، رسالوں وغیرہ کا چلن بھی اُردو کے مقابلے میں زیادہ رہا۔صوبہ جمّوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہاں کے کُتب فروش اُردو کی بہت کم کتابیں فروخت کرتے ہیں۔اس کی خاص وجہ ایک تو یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کم ہے۔دُوسرے یہ کہ اُردو کتابوں کی قیمتیں زیادہ ہونے کے باعث اکثر ان کی کتابیں بکتی نہیں۔اُردو اکادمیوں سے شائع ہونے والی کتابیں وہ فروخت نہیں کرتے کیوں کہ انھیں اس میں مالی فائدہ بہت کم نظر آتا ہے۔

اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے شعبۂ اُردو، جمّوں یونی ورسٹی، جمّوں بھی ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔شعبۂ اُردو کے زیرِ اہتمام سیمینار، کانفرنسیں اور ریفریشر کورس منعقد کیے جاتے رہے ہیں۔صوبہ جمّوں میں اُردو کے فروغ کے لیے باہر کے اُردو عالموں اور اہلِ زبان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ادیب و شاعر جو ریاست میں ملازمت کے سلسلے میں تشریف لائے اور انھوں نے زندگی کا تمام قیمتی وقت اُردو کی خدمت میں صرف کیا۔اُن کی خدمات قابلِ

ستائش ہیں۔اُن میں جمّوں یونی ورسٹی،جمّوں کے سابقہ صدر پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر شیام لال کالڑا، پروفیسر منظر اعظمی، اور پروفیسر خورشید حمرا صدیقی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں کے مقامی اساتذہ میں پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر نصرت چودھری، پروفیسر سکھ چین سنگھ، پروفیسر وجئے دیو سنگھ، چین سنگھ، پروفیسر ضیاالدین اور پروفیسر شہاب عنایت ملک اور بھی تحقیقی وتنقیدی کاموں میں مصروف ہیں۔

شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی،جمّوں، ریاستی کلچرل اکادمی،جمّوں، انجمن فروغ اُردو، انجمن ترقی اُردو اور دیگر اِداروں نے تحقیق وتنقید کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔کلچرل اکادمی کا ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب''، محکمہ انفارمیشن کا ''تعمیر''، ''فروغِ اُردو''جمّوں،'' تسکین'' جمّوں، کشمیر عظمیٰ جموں''سندیش'' جموں، ''دھنک'' (راجوری)،''چوگان'' (کشتواڑ)،''شاہین'' (بھدرواہ)،''سراج'' (بھدرواہ) وغیرہ نے ،جمّوں کے اخبارات و رسائل میں اپنا نام پیدا کیا ہے اور اُردو کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

ریڈیو کشمیر،جمّوں بھی اُردو کی ترقی کے لیے اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہاں کے مقامی ادیبوں اور شاعروں کو بھی ریڈیو پروگرام کا موقع ملتا ہے۔ریڈیو اسٹیشن جمّوں سے ایک زمانے میں ''آبشار'' کے نام سے ایک ادبی پروگرام ہوا کرتا تھا جواب ''خرمن'' کے نام سے دوبارہ نشر ہو رہا ہے اور اب ''آبشار'' ٹی.وی پر دِکھایا جا رہا ہے۔اس پروگرام میں مُلک کے نامور شعرا کی شخصیت اور کارناموں کو پیش کیا جاتا ہے اس خطّے کے طلبہ اور اُردو شعروادب کا شوق رکھنے والوں کے لیے یہ ۲۵ منٹ کا پروگرام بہت معلومات افزا اور دِل چسپ ہوتا ہے۔اس پروگرام کی تحقیق ،ترتیب وتشکیل وپیش کش ایک عرصہ تک اُردو کے نامور محقق وشاعر اور شعبۂ اُردو کے استاد پروفیسر ایس.ایل.کالڑا، عابد پیشاوری صاحب انجام دیتے رہے اِن کے اِنتقال کے بعد یہ خدمت مختلف لوگوں سے لی جاتی رہی اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ریڈیو اسٹیشن جمّوں، خطّہ جمّوں کی پوری نمائندگی کرتا ہے کافی دنوں تک یہاں سے اُردو میں خبریں(News Bulttin) نشر نہیں کی جاتی تھی لیکن اُردو اور ہندی کے مِلے جُلے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ صوبہ جمّوں میں اُردو کی حالت بہتر بنانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب اس کی طرف خاص توجّہ دیں۔ ایسے علاقوں میں جہاں اُردو زوال پذیر ہے وہاں اس کے فروغ کے لیے نئی راہیں پیدا کی جائیں مثلاً پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں میں اُردو پڑھانے کا خاص اِنتظام کیا جائے اور ریاستی حکومت کی جانب سے تمام سہولتیں میّسر ہوں۔ اُردو اساتذہ کی تقرری، رعایتی قیمتوں پر کتابوں کی دستیابی اور اُردو میں اچھے نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات کا اِنتظام کیا جائے۔

☆ مقابلے کے تمام امتحانوں میں دُوسری زبانوں کی طرح اُردو میڈیم بھی شامل کیا جائے۔

☆ صوبہ جمّوں میں اُردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ اس خطّے میں بھی اُردو سے شغف رکھنے والوں کو اُردو کی ترقی وترویج کے مواقع میّسر ہوں۔

☆ اُردو کتابوں کی فروخت رعایتی شرح پر ہو اور کتابوں کا پرنٹ مناسب ہو۔ کتابیں چھپوانے کے لیے مصنفوں کو سب سیڈی دیا جائے۔

☆ اُردو اساتذہ کی تقرری پر خاص توجّہ دی جائے۔

☆ صرف چند مقامات پر مشاعروں، ادبی محفلوں، نشستوں اور کانفرنسوں سے اس کمی کو دُور نہیں کیا جا سکتا بل کہ مندرجہ بالا پہلوؤں پر غور کرنا اور ان کو عملی جامہ پہنوانے کی کوشش کرنا بھی لازمی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کی کلچرل اِکادمی اِس سلسلے میں سرگرم ضرور ہے لیکن اِس کی ذمہ داریاں ریاست کی تمام زبانوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن سرکاری زبان اور ریاست کے مختلف علاقوں کے علاوہ دُنیا کے دوسرے علاقوں کے اُردو داں عوام سے رابطے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کا اہم ترین ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اُردو کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاستی حکومت سے خصوصی توجہ اور حوصلہ افزائی کی اُمید رکھے۔

اکائی نمبر 10: اردو جموں وکشمیر کی درباری وسرکاری زبان

ریاست جموں وکشمیر تین جغرافیائی خِطوں پر مشتمل ہے۔ جموں، کشمیر اور لداخ۔ جموں وکشمیر ریاست کی حکومت کی ڈور باگ اس وقت مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں میں آئی جب 16 مارچ 1846ء میں امرتسر معاہدے کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے دولت کے عوض جموں اور کشمیر کے صوبوں پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ لداخ کا خطہ تو پہلے ہی اُن کے قبضے میں تھا۔ ڈوگروں کا یہ دورِ اقتدار ایک صدی سے بھی زائد عرصے پر پھیلا رہا۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں ریاست کا اکثر سرکاری کام کاج فارسی زبان کے ذریعہ عمل میں آتا تھا۔ ڈوگرہ راج ہونے کے سبب ڈوگری کی سرپرستی بھی کی جارہی تھی لیکن اُنیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں اُردو زبان کا فروغ ہوا اور فارسی زبان کا انحطاط شروع ہوگیا۔ یہ لسانی اثر ڈوگرہ حکومت پر بھی پڑا۔ ایک تو ڈوگرہ حکومت کے شمالی ہند کے درباروں کا حکومتوں سے گہرے مراسم بھی تھے۔ دوسرے ریاست کے تینوں خطوں کی زبان اور بولیاں بھی مختلف تھیں۔ شمالی ہند سے جو مختلف امور کے سلسلے میں لوگ جموں آیا کرتے تھے وہ اُردو میں ہی بات چیت کیا کرتے تھے۔ ڈوگری، پنجابی سے گہرا لسانی رشتہ رکھنے کے سبب اُردو سے بھی زیادہ قریب تھی۔ اس وجہ سے جموں والوں کو اُردو دیکھنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ چناں چہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت (1857۔1885ء) سے ہی جموں میں اُردو کے لیے ماحول سازگار رہا ہے۔ ان کے دربار سے جو عالم اور فاضل وابستہ تھے وہ اُردو سے واقف تھے۔ جن میں دیوان کرپارام، غوث محمد ہشیار پوری، پنڈت رام کرشن وغیرہ کے نام خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ریاست، خصوصی طور پر جموں میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت، ریاست کے مختلف خطوں کی لسانی تقسیم اور شمالی ہند سے تہذیبی، تجارتی اور لسانی روابط کے سبب مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ولی عہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1885-1925ء) نے 1889ء میں فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری اور درباری زبان کا درجہ عطا کیا۔ اس طرح تمام ریاست میں اُردو زبان کی ترویج واشاعت کی راہیں ہموار ہونے

لگیں۔تقریباً بیسویں صدی کے وسط تک ریاست جموں وکشمیر میں تعلیمی ،ادبی،صحافتی اور سیاسی غرض کہ ہر شعبے حیات پراُردو زبان کا ایک اہم اور واضح کردار متعین ہو چکا تھا اور اس زبان نے ریاست کی مختلف لسانی اکائیوں کے مابین لنگوافرانیکا کا مرتبہ بھی پالیا تھا۔آخرار 1956ء میں جب ریاست کا آئین منظور ہوا تو ریاستی قانون ساز اسمبلی نے اُردو کی غیر معمولی عوامی سطح پر مقبولیت کی وجہ سے اس کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی توثیق کی۔

ریاست جموں وکشمیر چوں کہ مختلف النوع بولیوں اور زبانوں کا علاقہ ہے۔یہاں بولی جانے والی تمام بولیاں اور زبانیں اپنے اپنے جغرافیائی علاقوں تک محدود ہیں۔ان کا اثر ورسوخ دوسرے علاقوں تک نفی کے برابر ہے۔اسی سبب سے کہ کسی ایک علاقے یا خطے کو دیگر علاقوں پر لسانی اور سیاسی برتری حاصل نہ رہے ، ایک سیاسی حکمت عملی اور بہتر منصوبے کے تحت اُردو زبان کو اس اعزاز سے سربلند کیا گیا۔ہاں انگریزی زبان کے استعمال کی گنجائش ضرورت کے مطابق واضح طور پر رکھی گی۔

آئین کے چھٹے شیڈول میں کشمیری ، ڈوگری ،بلتی ، دردی ، پنجابی اور لداخی کو علاقائی زبانوں کے طور پر درج کیا گیا ہے اور ان تمام زبانوں بشمول اُردو اور ہندی کی ترقی اور اشاعت کے لیے دفعہ 196 کے تحت جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کو قائم کیا گیا۔

کسی بھی کثیر لسانی ملک ، ریاست یا خطے میں وہاں کی کسی ایک یا کئی زبانوں کو سرکاری درجہ دیئے جانے سے فطری طور پر کئی قسم کے مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔جو کہ بعض دفعہ خطرناک صورت حال بھی اختیار کر سکتے ہیں۔اس لیے سرکاری درجہ دیئے جانے سے ایک زبان اور اُس کے بولنے والوں کا ہر لحاظ سے احترام بھی باقی رہتا ہے۔خاص طور پر ان کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اُن کی شمولیت کے در کھل جاتے ہیں۔یہی اسباب ہیں ایسے حالات میں ایک فطری یا ناوابستہ زبان کو ہی سرکاری درجے کا اہل بنایا جائے تا کہ کوئی بھی مقامی لسانی جماعت کسی طرح کی احساسِ کمتری کی شکار نہ ہو۔خاص بات یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کسی مخصوص علاقے کی مادری زبان نہیں ہے اس کے

باوجود یہ زبان ریاست کے باشندوں کے لیے اجنبی بھی نہیں ہے۔اس لیے اُردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر منتخب کرنا دوراندیشی بھی ہے اور دانشمندی بھی۔

دانش مندوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ تہذیبی، مذہبی، نسلی اور لسانی اعتراضات کے سبب عمومی طور پر مُلک کی ہمہ گیر ترقی میں رکاوٹ بھی پیدا ہوسکتی ہے۔کیوں کہ اس طرح کی صورتِ حال میں بہتر اور وسیع ترین ترسیل وابلاغ کے وسائل محدود ہوجاتے ہیں۔ہلکی ہلکی باتوں پر علاقائی، لسانی اور مذہبی تعصب کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں اور سرکاری عملے کی توجہ ترقی کی رفتار تیز کرنے کے بجائے قانون کی بالادستی کے جتانے کی جانب مرکوز ہوجاتی ہے۔اس طرح کے ملکی ماحول اور حالات میں فطری زبان کی سرپرستی اور تشہیر ہمیشہ ہی ملکی اور قومی مفادات کے حق میں ہوتی ہے۔

ان اسباب کے ذکر کرنے کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت عطا کیا جانا، کی اہمیت بخوبی سمجھی جاسکتی ہے۔موجودہ حالات میں جموں وکشمیر میں کئی طرح کی بے چینی نظر آتی ہے لیکن کم از کم فی الوقت کسی طرح کا کوئی لسانی تنازع موجود نہیں ہے اور سرکاری زبان کے حوالے سے عوامی سطح پر کسی قسم کی کوئی بے تعلقی یا عدم توجہی کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔اس کے برعکس علاقائی زبانوں کے متعلق سرکار کی عدم دلچسپی کی شکایات آئے دن سنتے بھی دیکھتے پڑھتے بھی ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ زبان آج بھی دسویں تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے کہ افسوس یہ کہ جموں کے بعض علاقوں میں اُردو کی جگہ ہندی نہیں پڑھائی جارہی ہے۔ اب ایک اور نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔کشمیری، ڈوگری، پہاڑی اور گوجری کے حوالے سے ہر کوئی اپنی بولی یا زبان کے لیے لازمی قرار دینے یا اختیاری مضمون ہونے پر اصرار کررہا ہے۔یہ ریاست جموں وکشمیر کی سالمیت کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ کیوں کہ اُردو اُردو زبان نہ صرف ریاست کے تینوں خطوں اور مختلف مذہبی، نسلی اور تہذیبی اکائیوں کے درمیان ایک رابطے کی زبان ہے بلکہ اس دور میں بھی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور استعمال ہونے والی زبان ہے۔یہی وہ زبان

ہے جس نے ریاست جموں وکشمیر کے تینوں خطوں کو وحدت میں باندھ رکھا ہے جس دن یہ زبان سرکاری درجے اور پڑھنے لکھنے سے غائب ہوئی تو سمجھ لیجئے اسی دن ریاست کی وحدت پارہ پارہ ہوکر بکھر جائے گی۔

اس بات کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے کہ عصرِ حاضر میں تخلیقی اور صحافتی اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ اُردو زبان ہے۔آج بھی ریاست کے ہر خطے میں مقامی ادیب،شاعر جہاں اپنی مادری زبان کو ادبی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں وہیں اپنے تصورات، خیالات ،مشاہدات اور تجربات کی وسیع ترسیل کے لیے اپنی تخلیقات اُردو میں پیش کرتے ہیں۔صحافتی اور ماس میڈیا کے دیگر وسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان میں بھی اُردو کو نمایاں مقام حاصل ہے۔اخباروں کی ایک بڑی تعداد اُردو میں شائع ہوتی ہے اور یہ اخبار ریاست کے گوشے گوشے تک پہونچتے ہیں اور ہر مقام پر دلچسپی کے ساتھ پڑھے بھی جاتے ہیں

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُردو ریاست کی سرکاری زبان تو ہے لیکن اس کی ترقی ،ترویج واشاعت میں سرکاری سطح پر جدوجہد نفی کے برابر ہے۔یوں تو اسمبلی کے جلسوں میں بڑے لمبے لمبے دعوے کیے جاتے ہیں۔کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں لیکن عملی سطح پر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھائے جاتے۔سرکار کی عدم توجہی ہی ریاست میں اُردو کی سُست رفتاری کی دلیل ہے۔اس کے باوجود اُردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد حوصلہ افزا ہے۔

اکائی نمبر 11: آزادی کے قبل غیر سرکاری اداروں کی خدمات

کسی بھی زبان کو فروغ دینے اور اُسے مقبول بنانے میں اُن ادبی انجمنوں کا رول بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً ادبی تقاریب کا انعقاد کر کے لکھنے والوں کو نئی تحریک بخشتی ہیں۔ ریاست کی مختلف زبانوں کی ترقی و ترویج کے لیے ادبی انجمنیں اُنیسویں صدی کے وسط سے ہی سرگرم رہی ہیں۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے، ماضی میں بھی اور موجودہ دور میں بھی کئی غیر سرکاری اِدارے اُردو کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ غیر سرکاری ادبی اِدارے مشاعروں، سیمی ناروں، ادبی بحث مباحثوں اور تقاریب کا اہتمام کر کے اُردو کی بقا کے لیے اور اُردو کو اُس کے حقوق دِلانے کے لیے کلیدی رول ادا کر رہے ہیں۔ اِن ادبی تنظیموں کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے ریاست میں اُردو مقبول سے مقبول تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود سرکار اِس زبان کے تئیں وہ برتاؤ نہیں کر رہی ہے جو اُسے کرنا چاہئے۔ ریاست میں آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی مختلف ادبی تنظیموں نے اُردو کے سِلسلے میں جو کارنامے انجام دیے ہیں اُنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ریاست میں سب سے پہلی ''ادبی انجمن بزمِ سخن جموں'' نے بھی اِبتدا میں کہ جب اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، اِس زبان کی بے حد خدمات انجام دیں۔ چاہے نثر کا شعبہ ہو یا نظم کا، اِس انجمن کے بینر تلے مختلف نوعیت کے جلسے منعقد کیے گئے جن کی وجہ سے اُردو کا حلقہ وسیع ہو گیا۔

بزمِ سخن جموں کا قیام 1912ء میں عمل میں لایا گیا۔ اِبتدا میں اِس کی مہینے میں دو دفعہ ادبی میٹنگیں منشی غلام حیدر چشتی کے گھر پر منعقد ہوتی تھیں۔ جیسا کہ اِس انجمن کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اِس کا مقصد شاعری کو فروغ دینا تھا لیکن 1932ء میں یہ محسوس کیا گیا کہ اِس کے اغراض اور مقاصد کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ اِس لیے 1933ء میں اِس بزم کا نام تبدیل کر کے بزمِ اُردو رکھا گیا اور اِس کے دروازے ادب کے دُوسرے تخلیقی شعبوں کے لیے بھی کھول

دیے گئے۔ 1937ء میں قیس شیروانی اِس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اِس بزم کا قیام چندنوجوانوں کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ اِن سرگرم نوجوانوں میں میرزا مبارک بیگ، شیخ غلام محمد خان چشتی اور عبدالحکیم پیش پیش تھے۔ اِس کی اِبتدائی محفلوں میں مصرعہِ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ چراغ شاہ کی حویلی میں منعقدہ اِبتدائی جلسوں کے بعد اِس کی محفلیں غلام حیدر خان چشتی کے مکان پر منعقد ہوتی تھیں۔ 1947ء تک یہ بزم قائم رہی اور اِس دوران اِس کی سرگرمیوں کی بدولت جموں اور کشمیر کے نوجوانوں میں شعروسخن کا ذوق پروان چڑھتا رہا۔ بزمِ سخن کا نام جب تبدیل کر کے بزمِ اُردوٗ رکھا گیا تو 1942ء میں جناب کشوری لال کو اس کا صدر، جناب اظہر عسکری کو نائب صدر، جناب طارق کشمیری کو جوائنٹ سکرٹری اور جناب غلام محمد محی الدین اظہر کو اس کا خازن مقرر کیا گیا۔

بزمِ سخن نے متواتر ادبی محفلوں کے علاوہ سالانہ مشاعروں کا بھی اہتمام کیا۔ یہ مشاعرے اِتنے شاندار انداز سے منعقد ہوئے اور لوگوں کو ان سے اِتنی زیادہ دِل چسپی پیدا ہوگئی کہ وہ سال بھر مشاعرے کے منتظر رہتے تا کہ اپنے محبوب سخنوروں کا تازہ کلام سُن سکیں۔ بزم کے زیرِ اہتمام منعقدہ پہلے ہی مشاعرے میں اُردوٗ کے اعلیٰ پایہ کے شاعر حفیظؔ جالندھری، سیمابؔ اکبرآبادی، تاجورؔ نجیب آبادی، ہری چند اختر، موہن لال ساحرؔ، اثرؔ صہبائی، عابد علی عابدؔ جیسے شعرأ نے اپنے کلام سے جموں کے اُردوٗ شعروسخن کے شیدائی سامعین کو محظوظ کیا۔ یہ پہلا تاریخی مشاعرہ 1927ء میں منعقد ہوا اِس کی صدارت رچھپال سنگھ شیدؔا نے کی تھی۔

بزم نے جو مشاعرے منعقد کروائے، اِن کی وجہ سے جموں میں ادبی چہل پہل پیدا ہوئی۔ اِن مشاعروں کے دُوسرے دِن انجمنِ اِسلامیہ کا سالانہ جلسہ مسلم ہال میں منعقد ہوتا تھا اور رات کو شعروسخن کی محفل جمتی تھی۔ تعلیمی، ثقافتی اور ادبی محفلوں کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ بزم کے دُوسرے سالانہ مشاعرے میں چودھری خوشی محمد ناظرؔ، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، جگر مرادآبادی، احسان دانشؔ، ڈاکٹر محمد دین تاثیرؔ، نواب جعفر علی خان اثرؔ اور فیض احمد فیض نے شرکت کی تھی۔

بزم کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک اور اجتماع میں جب مولانا علیم الدین سالکؔ نے شرکت کی تو اُنھیں اِس بات کا احساس ہوا کہ بزم کے کام کو صرف جموں تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اِس میں وسعت لائی جائے اور اِس کی سرگرمیوں کو کشمیر میں بھی شروع کیا جائے۔ اِس طرح کشمیر میں اِس کی ایک شاخ کھولی گئی۔ اب بزم اُردوٗ جموں کا نام تبدیل کر کے بزمِ اُردوٗ جموں وکشمیر رکھا گیا۔ یہ نام اُس جلسے میں تبدیل کیا گیا جو سری نگر میں منعقد ہوا۔ اِس جلسے میں مشہور صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز کے علاوہ یوسف خان، عبداللہ قریشی، پنڈت دینا ناتھ چکن مست اور قیس شیروانی بھی موجود تھے۔ بزمِ اُردوٗ جموں وکشمیر کے پہلے صدر پنڈت دینا ناتھ مستؔ منتخب ہوئے۔ اِس کا ایک شاندار مشاعرہ مشن اسکول سری نگر کے احاطے میں منعقد ہوا۔

ریاست میں بزمِ ادب بڑی طویل مدت تک اُردو کے لیے کام کرتی رہی۔ اب اِس کے مشاعرے گرمیوں میں سری نگر میں منعقد ہونے لگے اور سردیوں میں جموں میں۔ ریاست کے صنعتی نمائش کے موضوع پر بھی یہ بزم سری نگر میں مشاعروں کے اہتمام کرواتی تھی۔ 1939ء میں اِس بزم کے زیرِ اہتمام ایسا ہی یادگار مشاعرہ سری نگر میں منعقد ہوا۔ کُل ہند ایجوکیشنل کانفرنس کا جب سری نگر میں اہتمام کیا گیا تو اِس میں ہندوستان کے مایۂ ناز ماہرینِ تعلیم مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، مولوی عبدالحق، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر امر ناتھ جھا، میاں بشیر الدین احمد اور غلام کیفی نے شرکت کی۔ بزم کی طرف سے اِس موقع پر ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے کی جو اُس وقت صدرِ انجمن ترقی اُردوٗ تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں سر تیج بہادر سپرو نے اُردوٗ کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں طویل اور تاریخی خطبہ دیا۔ دُوسرے دِن ڈل جھیل پر ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کے لیے شکارے سجائے گئے اور اِن شکاروں میں چاندنی رات میں ڈل میں شاعروں نے اپنے کلام سے نوازا۔ اِس مشاعرے کی روداد حبیب کیفوی نے ایک جگہ یوں لکھی ہے:

''رات چاندنی تھی، فضا میں خوشگوار خنکی سی تھی۔ ڈل کے سینے پر آرام دہ اور نظر

نواز شکاروں کا بیڑا رواں تھا۔ ہانجیوں نے شکاروں کو کچھ اِس طرح ترتیب دیا کہ
ایک حلقہ سا بن کر رنگ و نور کا تیرتا ہوا حلقہ نظر آنے لگا۔ جس شاعر کے پڑھنے کی
باری آتی وہ درمیان کے شکارے میں آ جاتا، اپنا کلام سُناتا اور پھر اپنی جگہ پر چلا
جاتا، کسی کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ بزم سطحِ آب پر تیر رہی ہے۔''

ریاست کے جن ادیبوں کو اِس بزم کی وساطت سے شہرت ملی اور جنھوں نے اِس بزم کی تقاریب میں شرکت کی اُن میں نند لال طالبؔ، غلام حیدر چشتی، غلام رسول نازکی، حبیب کیفیؔ، میکشؔ کاشمیری، کوثرؔ فردوسی، رسؔا جاودانی، منوہر لال دلؔ، غلام احمد فداؔ، کشن سمیل پوری، محمد نور الہاہی، قاضی نظام الدین، فتح حسین شاہ، موہن یاورؔ، کشمیری لال ذاکرؔ، نرسنگھ داس نرگسؔ اور اللہ رکھا ساغر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ 1947ء کے سانحہ کے بعد اِس بزم کے بعض اراکین یا تو پاکستان چلے گئے یا پھر فرقہ وارانہ فساد میں مارے گئے۔ تقسیم کا یہی سانحہ اِس بزم کو بھی لے ڈوبا۔ پھر بھی تقسیم سے پہلے ریاست جموں و کشمیر میں شاعری کے علاوہ فکشن اور تنقید کے شعبے میں اِس بزم نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اِس بزم کے بارے میں پروفیسر ظہور الدین اپنی کتاب

Development of Urdu Language & Literature in Jammu Region میں لکھتے ہیں:۔

"The out standing contribution of Bazm-i-Sukhan/ Bazam-i-Urdu Jammu is that it gives tremendous importance to poetery, fiction, drama & criticism in this region."

گویا ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں سرکار یا دربار کی بجائے بزم سخن یا بزم اُردو جموں و کشمیر کا کردار سب سے زیادہ اہم اور کارگر رہا ہے۔

اکائی نمبر 12: جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کا آغاز وارتقاء

کشمیر میں مُدتوں تک سنسکرت کا غلبہ رہا۔ سنسکرت میں کئی ادبی تاریخیں اور علمی شے پارے وجود میں آئے۔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے سنسکرت کے متعدد دانش ور ہیں جنھوں نے کشمیر کا نام سارے مُلک میں بلند کیا۔ چودھویں صدی میں مسلمان کشمیر آنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جو زبان ساتھ لائے وہ فارسی تھی۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی کو درباری زبان کا درجہ ملا اور اس کو دربار کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔ ۶۰۰ سال تک فارسی کا یہاں زبردست غلبہ رہا۔ ظاہر ہے جس زبان کو سرکاری سرپرستی ملے اور خلوصِ دل کے ساتھ ملے، وہ زبان جلدی ہی ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی ترقی کی راہوں پر گامزن ہوئی اور اس سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا، نتیجہ یہ نکلا کہ اس زبان کا ادب میں اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

جہاں تک اُردُو زبان وادب کا تعلق ہے یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ جب ڈوگرہ حکمرانوں کا راج تھا، یہاں متعارف ہوئی۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جو ریاست میں اُردُو کی مقبولیت کا سبب بنے۔ چوں کہ فارسی یہاں کہ سرکاری زبان تھی جس کی وجہ سے کشمیری زبان پر تہذیبی اعتبار سے دُوررس اثرات پڑے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے جب کشمیر کو خریدا اور اپنی حکومت قائم کی تو سیاسی مصلحتوں کے نتیجے میں بعض لوگ باہر جانے لگے۔ کشمیر کی حکومت نے دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ بھی تعلقات قائم کیے۔ کچھ لوگ باہر سے تجارت کی غرض سے کشمیر آنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان حکومتوں کے تعلقات آپس میں اور زیادہ مستحکم ہوئے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کا زمانہ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۶ء تک کا ہے۔ اس دوران اس حکومت کے تعلقات پنجاب اور یوپی کے بعض علاقوں سے گہرے تھے، جہاں اُس وقت اُردُو کا بول بالا تھا۔ کشمیریوں کو جب اُردُو سے لگاؤ پیدا ہوا تو اُنھیں یہ زبان سمجھنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ کشمیر میں کافی عرصے تک فارسی زبان کا غلبہ رہا تھا اور اُردُو لسانی اعتبار سے فارسی سے متاثر ہے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے اِس دور میں مُلک کے اُن حصّوں کے ساتھ تعلقات پُر امن اور گہرے تھے، اس لیے اُن علاقوں سے اُردُ و کے نہ صرف شاعر، ادیب یہاں آتے رہے بل کہ سیاح، تجارت پیشہ طبقہ بھی سیاحت اور تجارت کی غرض سے یہاں آیا۔ پھر وہ سرکاری آفیسر بھی یہاں آئے جو یہاں کے مقامی باشندوں سے اُردُ و میں بات چیت کرتے تھے۔ ۱۸۶۲ء تک اُردُ و نے یہاں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔ اِسی عرصے میں ہندوستان کے بعض مختلف شہروں سے ایسے ملازم دربار میں رکھے گئے کہ جن کا مقصد دربار میں جلال پیدا کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ملازم یہاں آئے تو وہ محض بوریا بستر لے کر ہی یہاں نہیں آئے، وہ اپنے خاندانوں کو بھی اپنے ساتھ لائے جن کی عام بول چال کی زبان اُردُ و تھی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد رنبیر سنگھ کا دور آتا ہے۔ یہ دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء پر محیط ہے۔ اُس وقت بھی اگر چہ کہ درباری زبان فارسی ہی تھی مگر چوں کہ مہاراجہ کو علوم وفنون سے دل چسپی تھی اس لیے عوام کو مغربی علوم وفنون سے آشنا کرنے کے لیے اُس نے اپنے دربار میں دوسری زبانوں کے دانشور بھی مقرر کیے جن میں فارسی اور اُردُ و کے دانشور بھی شامل تھے۔ اور بہت سی کتابوں کو ڈوگری، ہندی اور اُردُ و میں ترجمہ کرایا اور ان کتابوں کو باضابطہ شائع بھی کیا۔ اور اس طرح دوسری زبانوں کے ساتھ اُردُ و میں بھی آہستہ آہستہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس دوران بھی اُردُ و کے شعرا اور ادبا کا ریاست میں آنا جانا جاری رہا۔ نتیجہ کے طور پر اُردُ و ہر خاص وعام کی زبان بنی۔

۱۸۸۹ء میں جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اُردُ و کی اہمیت اور شہرت اور مقبولیت کو سمجھا تو اُنھوں نے اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اسے دفتروں اور تعلیمی اِداروں میں رائج کیا گیا۔ اس سے پہلے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں بھی اُردُ و کے فروغ کے لیے چند اقدامات اُٹھائے گئے۔ اُس دور میں بعض کشمیریوں نے لاہور سے چند اخبارات جاری کیے جن میں ''خیر خواہِ کشمیر''، ''مراسلہ کشمیر''، ''بہارِ کشمیر'' قابلِ ذکر ہیں۔ جب ریاست میں اُردُ و کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تو نتیجہ کے طور پر یہاں اُردُ و شعر وادب کے لیے فضا سازگار بنی

اور ریاست کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے اُردُو ہی کو اپنا وسیلۂ ذریعہ بنایا اور اُن کی شاعری اخبارات اور رسائل میں چھپنے لگی اور ۱۹۴۷ء تک بعض معتبر شعراء ریاست میں پیدا ہوئے۔ ان میں کشن لال حبیبؔ، کشن سمیلپوری، قیسؔ شیروانی، رسؔا جاودانی، نرسنگھ داس نرگسؔ، میکشؔ کاشمیری، غلام رسول تنہاؔ، دینا ناتھ مستؔ، عشرتؔ کاشمیری، منوہر لال دلؔ، اللہ رکھا ساغرؔ، غلام رسول نازکیؔ، دینا ناتھ رفیقؔ، نند لال کول طالبؔ، شہ زور کشمیری، مرزا کمال الدین شیداؔ، بلبلؔ کشمیری وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان میں سے بعض شعراء ایسے بھی ہیں جنھوں نے آزادی کے بعد بھی اپنے خونِ جگر سے شعر وادب کی محفل کو زندہ رکھا۔ اِن شاعروں کے مجموعۂ کلام آزادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی شائع ہوئے۔ آزادی سے پہلے غلام حسین تنہاؔ کا ''شبنمستان''، غلام رسول نازکیؔ کا ''دیدۂ تر''، کشن سمیلپوری کا ''فردوسِ وطن''، رسا جاودانیؔ کا ''لالہ صحرا''، منوہر لال دلؔ کا ''نقدِ دل''، غم طاوس کا ''موج موج'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے یہاں شاعری کا جو رجحان زیادہ نظر آتا ہے وہ وطنیت، حسن وعشق، منظر نگاری، آزادی اور سماجیات ہے۔ مذہبی اور مناظرِ فطرت جیسے موضوعات پر وشوا ناتھ در اور نند لال بے غرضؔ کی نظمیں اور غزلیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ بعض شاعروں نے کشمیری مناظر کی بڑی خوب صورت عکاسی بھی کی ہے۔ ان شعرا میں نند لال کول طالبؔ کی لکھی ہوئی مشہور نظم ''بہارِ کشمیر'' قابلِ ذکر ہے۔ قومی اور مذہبی موضوعات پر بھی ان کی نظمیں ملتی ہیں۔ دینا ناتھ مستؔ، کشن سمیلپوری۔ سماجی اور وطنی شعور کے علاوہ ان شاعروں نے فکر وفن کے اعتبار سے بھی شاعروں کو جلا بخشی اور کشمیر کے قدرتی مناظر کی عکاسی کر کے مناظرِ فطرت کے رُجحان کو آگے بڑھایا۔ رسؔا جاودانی کی ابتدائی غزلوں میں اگر چہ کہ رومانیت کی چھاپ ہے لیکن اُن کی بعض نظمیں فطرت کی عکاسی بھی کرتی ہیں اور آپسی اتحاد پر زور دیتی ہیں۔ انھیں غزل لکھنے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ میر غلام رسول نازکیؔ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی، کچھ قطعے بھی تحریر کیے۔ ان کی شاعری میں کلاسکیت کے اثرات بھی ہیں اور اقبال کے اثرات بھی۔ یہاں ان شاعروں کے چند اشعار پیش کرنا ضروری ہیں جو اِن شاعروں کے ابتدائی شعری رجحان کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں:

مری آنکھوں میں حُسنِ یار کی تصویر پنہاں تھی
تو میرے روکنے سے پاس باں کے ساتھ کیا آتا

کلاسیکی

.....

بہار میں شباب ہے شباب انتخاب ہے
نظر کی آب و تاب ہے کہ حسن لاجواب ہے
عذات ہے ثواب ہے سکون و اضطراب ہے
یہ عالمِ مجاز ہے
کہ زندگی کا راز ہے

(نندلال کوطالبؔ)

تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک
تیرے پیغام کا سہارا ہے

رساؔ

.....

کہیں دیر و کعبہ کے درمیان کوئی ایک مقام حسین تھا
وہاں رقص تھا، وہاں جام تھا، وہیں جا کے ہم بھی ٹھہر گئے

(کشن سمیلپوری)

.....

تمام عمر رہا سامنا قیامت کا
غمِ حبیب کی خاطر غمِ جہاں کے طُفیل

.....

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی جمّوں خطے میں ادبی سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں۔ ملک کے نامور شاعر اور ادیب اس خطے میں موجود تھے۔ خاص کر پنڈت دتاتریہ کیفی، جعفر علی خان، اثر لکھنوی اور خوشی محمد ناظر وغیرہ۔ اس ادبی ماحول کی وجہ سے ۱۹۱۲ء میں بزمِ ادب جیسی تنظیم وجود میں آئی جس کی وجہ سے یہاں باقاعدہ مشاعروں کا آغاز ہوتا ہے۔ ملک کے نامور شاعر مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ چوں کہ نشر و اشاعت پر شروع میں پابندیاں تھیں، اس لیے یہاں کے مقامی ادیبوں کی تخلیقات ریاست سے باہر چھپنے والے رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن جب ۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے اُردُو کا پہلا اخبار ''رنبیر'' جاری کیا تو مقامی شاعروں کی تخلیقات اس میں چھپنے لگیں جس سے شاعروں کو حوصلہ ملا۔ وہ شعر و ادب کی خدمت اور زیادہ کرنے لگے اور شعر و شاعری کو اور زیادہ فروغ ملا۔

جمّوں و کشمیر میں اُردو شاعری آزادی کے بعد

۱۹۴۷ء تک ریاست میں جو شاعر پیدا ہوئے اور جنھوں نے اپنے شعری ذہن کی وجہ سے اُردُو شاعری کی آبیاری کر کے روایت پسندی اور کلاسیکی رجحان کی پیروی کی اُن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اُن شعراء میں بعض ایسے شاعر بھی ہیں جنھوں نے آزادی کے بعد بھی اپنا لوہا منوایا اور مختلف حادثات اور واقعات سے متاثر ہو کر اُردُو شاعری میں نئے تجربے بھی کیے اور فنّی اعتبار سے بھی اُردُو شاعری کو مستحکم کیا۔

۱۹۴۷ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال جہاں ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزادی ملی، وہیں دو قومی نظریے کے تحت دو ملک ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے وہ سیاسی جد و جہد اور کشمکش کا دور ہے جس میں سماجی اور معاشی تعمیرِ نو کو فروغ دینے کی طرف توجہ دی

جانے لگی۔الحاقِ کشمیراور قبائیلی حملے کی وجہ سے یہاں کے عوام عجیب صورتِ حال کا شکار ہوئے۔

Progressive Writers Movement کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔جس کا مقصد نوجوانوں کو تہذیب و ثقافت اورادب کی طرف متوجہ کرنا تھا۔شعراء نے بھی نئی کروٹ لی اور اُن کی فکر میں بھی تبدیلی آئی۔ترقی پسند رویے نے شاعری کو بھی متاثر کیا۔اگر چہ کہ شاعروں نے روایتی انداز میں ہی شاعری کی۔ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کے نظریے کو پیش کیا جانے لگا۔چند شاعروں نے مناظرِ قدرت اور مذہبی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں۔رحمان راہی اورامین کامل کشمیری کے اُردُو شعرامیں جہاں ایک طرف رومانیت ملتی ہے وہیں دوسری طرف نئی تحریکیوں کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔مہندر رینہ،غلام محمد نسیم،اور خموش سرحدی نے نظمیں اور غزلیں لکھ کر ابتدا میں آزادی کے بعد ریاست میں اُردُو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔آزادی کے بعد کے سب سے اہم اور کامیاب شاعر شہ زور کشمیری ہیں۔

شہ زور علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔اُنھیں زبان کے نکات اور شعری اسالیب پر قدرت حاصل تھی۔غزل پر پوری دسترس حاصل تھی۔اُنھوں نے اپنے عہد کے فنّی اور سماجی شعور کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔اُنھوں نے چند قطعے اور رباعیاں بھی لکھیں۔اُن کی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔کشمیر کے مناظر پر اُن کی لکھی ہوئی نظمیں ''وادیٔ کشمیر''،''شالامار باغ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

میر غلام رسول نازکی کی شاعری کا آغاز آزادی سے پہلے ہو چکا تھا لیکن آزادی کے بعد اُنھوں نے اپنے اسلوب اور لہجے کی وجہ سے ریاست کے شعرامیں ممتاز مقام بنالیا۔آپ نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رباعیاں بھی لکھی ۔ان کی شاعری میں بھی اگر چہ کلاسیکی رجحان ملتا ہے مگر وہ اس رجحان کی پیروی اپنے الگ ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ اُردُو میں اِن کے دو مجموعے ''دیدۂ تر'' اور ''متاعِ فقیر'' قابلِ ذکر ہیں۔غلام محمد میر طاوس نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن بعد میں نظم کی طرف مائل ہوئے اور کافی اچھی نظمیں لکھیں،جن میں ''یورپ اور جنگ'' اور ''چندہ ہار'' قابلِ ذکر ہیں۔

رسا جاودانی کا مجموعۂ کلام ''لالہ صحرا'' اگر چہ کہ آزادی سے پہلے شائع ہو چکا تھا لیکن آزادی کے بعد ۱۹۶۲ء

میں اُن کا دوسرا مجموعۂ کلام ''نظمِ ثریا'' کے عنوان سے چھپا تو رسؔا کا شمار نہ صرف ریاست کے اہم شعرا میں ہونے لگا بل کہ ریاست کے باہر بھی اُن کی شاعری کو پسند کیا گیا۔ رسؔا جاودانی کو شاعری کے فن پر پوری دسترس حاصل ہے۔ اُنھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ اُن کی غزل سادہ ہے اور نظموں میں وہ مناظر فطرت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ''طوفان''، ''ساون''، ''بیتے دِنوں کی یاد'' وغیرہ اُن کی قابلِ قدر نظمیں ہیں۔

شوریدہ کاشمیری نے بھی آزادی کے بعد اپنی شاعری سے ریاست میں اُردُو شاعری کے دامن کو وسیع کیا۔ ان کے دو مجموعے کلام چھپے ہیں جن میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ہیں۔ اِن کی غزل میں جہاں کلاسیکی ترکیبات اور روایتی خیال آرائی ملتی ہے وہیں اپنی نظموں میں انھوں نے کشمیر کے دلفریب مناظر کی عکاسی بھی کی ہے۔ ''باغِ نشاط''، ''ڈل کا منظر'' اور ''ڈل اور چاند'' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

قیصر قلندرؔ، اکبر جے پوری، فاروق نازکیؔ، پروفیسر حامدی کاشمیری، حکیم منظور، غلام نبی ناظر وغیرہ شعراء نے بھی کشمیر میں اُردُو شاعری کی روایت کو مستحکم کیا۔

اِدھر جمّوں میں آزادی کے بعد چند ایسے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے لیے ایک منفرد مقام بنا لیا۔ اِن شعرا میں میکشؔ کاشمیری، عرشؔ صہبائی، محمد یاسین بیگ، عابدؔ مناوری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا کے مجموعۂ کلام چھپ کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ عابدؔ مناوری کا مجموعہ کلام ''بہارِ غزل'' اور ''شمیمِ گل''، پرتپال سنگھ بیتابؔ کا ''خودرنگ'' قابلِ ذکر ہیں۔ اِن شاعروں کے یہاں نئے لب و لہجے اور علامتوں کے ذریعے شاعری کو پیش کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ یہ علامتیں اُنھوں نے اپنے آس پاس کے ماحول سے لی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شاعر اپنے ماحول سے جُڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جنس، رومان، میخانہ اور شیخ سے چھیڑ چھاڑ بھی ملتی ہے اور زندگی کے مسائل اور مصائب کا احساس بھی۔ پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ اور پروفیسر عابدؔ پیشاوری کا تعلق اگرچہ کہ ریاست سے نہیں ہے مگر ریاست میں رہ کر اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے اُردُو شاعری کی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

موجودہ دور میں عرشؔ صہبائی، میکشؔ کاشمیری، تنویرؔ بھدرواہی، فداؔ راجوروی، شہبازؔ راجوروی، پروفیسر ظہور الدین، نشاطؔ کشتواڑی، رفیق رازؔ، شفقؔ سوپوری، فرید پربتیؔ، نذیر آزادؔ وغیرہ شاعر ریاست میں اُردُو شاعری کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ان شعراء میں سے بعض کے مجموعۂ کلام بھی چھپ چکے ہیں اور ملک کے مختلف رسائل میں بھی ان کی غزلیں چھپتی رہتی ہیں۔ان شعراء نے ریاستی حالات وواقعات سے متاثر ہوکر اور بین الاقوامی سطحوں پر رونما ہونے والے افکار و واقعات سے گہرا تاثر قبول کیا ہے۔اُنھوں نے موجودہ دور کے آشوب اور حالات کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔پروفیسر حامدی کشمیری رقمطراز ہیں:

''نئے شعراء کے کلام میں محرومی، فریب اور بیچارگی کے اثرات
زیادہ نمایاں ہیں.....کبھی کبھی ان کے لہجے میں اضطراب،
تلخی، نفرت اور بغاوت کی شعلگی کا احساس بھی ہوتا۔''

شوریدہؔ کاشمیری: غلام محمد ملک نام اور شوریدہؔ تخلص تھا۔۱۹۲۴ء میں شوپیاں کے ایک زراعت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔اِبتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے اور علی گڑھ یونی ورسٹی سے اُردُو میں ایم اے کیا۔محکمۂ تعلیم میں اُستاد کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن بعد میں ریاست کے مختلف کالجوں میں اُردُو پڑھاتے رہے۔۱۹۹۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شوریدہؔ کا شُمار بھی کشمیر کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری جہاں ایک طرف روایت اور کلاسیکی رجحان کی پیروی کرتی ہے تو دوسری طرف وہ اپنے گردوپیش کے واقعات اور حالات سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اور ان کو فنّی حسن کے ساتھ شاعری میں بھی پیش کیا ہے۔قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں جدت پسندی بھی پائی جاتی ہے۔پروفیسر حامدی کاشمیری ان کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات یوں قلم بند کرتے ہیں:

''شوریدہ کاشمیری جہاں غزل کے تعلق سے اپنی قدامت

پسندی کا احساس دلاتے ہیں وہاں آزاد اور حالی کی قائم کردہ
نظمیہ روایات سے بھی جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔''

شوریدہ کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''جوشِ جنوں'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ٹھیک پانچ سال بعد یعنی ۱۹۸۶ء میں ان کا دوسرا مجموعۂ ''جذبِ دروں'' منظرِ عام پر آیا۔ ان کی شاعری میں جہاں مزاحیہ انداز ملتا ہے وہیں سنجیدگی کا عنصر بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ پروفیسر عبدالقادری سروری رقمطراز ہیں:

''شوریدہ شعر میں بڑا انہماک رکھتے ہیں۔ انھیں سنجیدہ اور
مزاحیہ دونوں انداز پر دسترس حاصل ہے۔ وہ عرصہ تک آثر
صہبائی سے مشورۂ سخن کرتے رہے اور اب وادی کے اچھے
صاحبِ فکر شعراء میں ان کا شُمار ہوتا۔''

ان کی شاعری میں کلاسیکی ترکیبات اور استعارات کی کثرت بھی ہے۔ شاعری میں جہاں روایتی خیال آرائی ملتی ہے تو وہیں تازگی، تخیل اور پیکر تراشی کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔ غلام نبی ناظر ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جوشِ جنوں کا شاعر جذبِ دوراں تک سفر کرتے کرتے
ایک اور بلند مقام تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ شوریدہ کے
بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں تخیل کی بلندی اور
مشاہدات کی تازگی اور جذبات کی شدت، اِنسانی ہمدردی
اور اخوت کے جذبے کی کشش بدرجہ اتم موجود ہے۔''

غلام نبی ناظر کے مندرجہ بالا قول کی تصدیق شوریدہ کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے:

بن گیا تھا دل زمانے کا ہدف
اب زمانہ خود نشانہ ہو گیا

ترے رخ سے روشن ہوا سب جہاں
ترے گیسوؤں سے ٹپکتا رہا

ان کے اشعار میں مٹھاس بھی پائی جاتی ہے ۔

یہ سرخیٔ رُخسار یہ سینے یہ صباحت
کیا رنگِ شفق نورِ سحر دیکھ رہا ہوں
حُسن اس درجہ شعلہ بار ہوا
لاکھ پردوں سے آشکار ہوا

شوریدہؔ کاشمیری کو اپنے وطن یعنی کشمیر سے بھی بے حد محبت ہے اور اس کے حسین مناظر اور اس کے حسن کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ''ڈل کا منظر''، ''باغِ نشاط'' اور ''ڈل اور چاند'' ان کی لازوال نظمیں ہیں۔

''ڈل کا منظر'' کا یہ بند دیکھئے:

ڈل سہانا ہے کیا چاندنی رات میں ہے یہ غرقاب کیا جلوۂ ذات میں
ایک طوفان برپا ہے جذبات میں جانے ڈوبا ہے دل کن خیالات میں
غوطہ زن ہوکے موتی لگے ہاتھ میں
دامنِ دل میں لایا ہوں میں ساتھ کچھ

مزاح اور شوخی بھی شوریدہؔ کی شاعری کی خصوصیات ہیں:

سوزِ پنہاں سے دل کباب ہوا آشیانہ ترا خراب ہوا
حسنِ نظارۂ سوز نے مارا بے حجابی میں بھی حجاب ہوا
ہائے وہ اولیں نگاہ کہ جب دل میں برپا اک انقلاب ہوا

مختصراً شوریدہؔ کاشمیری نے ریاست جمّوں وکشمیر کی شعری روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چوں

کہ وہ شاعری کے رموز وفن پر پوری دسترس رکھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں فنّی خامیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔
غلام نبی ناظر شوریدہؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شوریدہ کی شاعری میں کلاسیکی ترکیبات واستعارات اُن
کے شعری رویے کی غمازی کرتے ہیں۔اُن کی غزلوں میں
روایتی خیال آرائیوں کے ساتھ تازگی، تازگیٔ تخیل اور پیکر
تراشی کی نزاکت محسوس کی جاسکتی ہے۔شوریدہؔ احساس،
جذبے اور مشاہدے میں دیانت داری، سادگی اور روایت
کے پہلو بہ پہلو روانی اور مٹھاس بھی پیدا کرتے ہیں۔''

شہ زورؔ کاشمیری: شہ زورؔ کشمیری اُردُو شاعری کے ریاست کے اہم ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چوں کہ شاعری کے فن پر اُن کو پوری دسترس حاصل ہے اِس لیے اُن کا شُمار ہندو پاک کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک اُستاد شاعر کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''اُنہوں نے اِتنی ریاضت کی ہے کہ اب نہ صرف کشمیر بل
کہ ہندوستان اور پاکستان کے سخن وروں میں اُنہیں
اُستادی کا مرتبہ حاصل ہوگیا ہے۔''

شہ زورؔ ۲۷ فروری ۱۹۱۵ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ والد نے غلام قادر نام رکھا، لیکن ادبی حلقوں میں شہ زورؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے شہ زورؔ نے سری نگر کے مختلف اسکولوں سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں سری پرتاپ کالج سے بی.اے پاس کر کے چیف اکاونٹ آفیسر مقرر کر دیے گئے۔ شاعری اور موسیقی کا

شوق بچپن سے ہی تھا۔ ان کے والد کو چوں کہ شعروادب سے خود بھی دل چسپی تھی اسی لیے انھوں نے اِبتدا میں اِس میدان میں شہ زورؔ کی پوری رہنمائی اور پیروی کی۔ ابھی دسویں کلاس کے طالب علم ہی تھے کہ انھوں نے ایک غزل لکھ کر ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں پیش کی۔ اُنھوں نے کالج میگزین ''پرتاپ'' کے لیے بھی غزلیں لکھیں۔ مولانا مصودی نے اُن کی ایک غزل سُن کر اُنہیں سیمابؔ کی شاگردی میں جانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد وہ سیمابؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ نتیجہ کے طور پر ان کی شاعری میں نِکھار آتا گیا۔ اپنے اشعار میں انھوں نے سیمابؔ اکبرآبادی کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً ؎

یہ اے شہ زورؔ ہے سیمابؔ کے فیضان کا صدقہ
ملا الہام میں حصّہ مرے قلبِ غزلخواں کو

شہ زورؔ کی ادبی زندگی کا آغاز اصل میں ۳۷۔۱۹۳۶ء میں ان کی منظومات، مقامی اخبارات اور رسائل میں چھپنے سے ہوا۔ اس کے بعد ان کا کلام ملک کے معتبر اُردُو رسائل مثلاً ''آج کل''، ''ہندوستانی ادب''، ''عالمگیر'' اور ''نیرنگ خیال'' وغیرہ میں متواتر چھپنے لگا۔ ان کی پہلی نظم ''ظلم کے آنسو'' ملک کے مشہور ومعروف رسالے ''شاعر'' میں چھپی۔

اُردُو کے علاوہ شہ زورؔ کو فارسی، عربی اور ہندی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ سیدھی سادھی زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، شہ زورؔ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''شہ زورؔ حد درجہ خلوت پسند ہیں۔ ادبی انجمنوں سے ہمیشہ
> دُور دُور رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک محمود ہاشمی کے اصرار پر
> انجمنِ ترقی اُردُو کی نشستوں میں شرکت کرتے رہے۔
> بالکل سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں۔ نماز و روزہ کے
> پابند ہیں۔ مذہبی خیالات اُن کی گھٹی میں پڑے ہیں۔''

شہ زورؔ نے جس زمانے میں شاعری شروع کی وہ ایک بحرانی دور تھا۔ ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ آزادی کی تحریک عروج پر تھی۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ادب میں بھی مقصدیت کو پیش کیا جانے لگا تھا۔ ہماری ریاست میں بھی لوگ جاگیردارانہ نظام کے خلاف آوازیں بلند کررہے تھے۔ شہ زورؔ ریاست میں صدیوں کی غلامی، افلاس اور پسماندگی کا شعور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اکثر نظموں میں سماجی شعور کی گہرائی کا احساس ملتا ہے۔ اُنھوں نے بعض اچھی اچھی انقلابی نظمیں کہیں ہیں جن میں ''جاگ'' اُن کی مشہور نظم ہے۔ ''اے ہندوستان'' اُن کی ایک اور مشہور نظم ہے جس سے ہندوستان کے تئیں اُن کی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی بعض نظموں کہ جن میں ''تاثیر''، ''ساقی''، ''انتخاب'' وغیرہ شامل ہیں میں شکست خوردگی اور بے اطمینانی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں رومانیت کی گہری چھاپ بھی ہے۔ مثلاً ؎

جانے کیوں مرے دل میں جھانکتی ہیں پھر تیری
مدتوں کی یادیں اور مدتوں کی تصویریں

شہ زورؔ نے اقبال کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ان سے بے حد متاثر بھی ہیں۔ اُن کے کلام میں جلال و جمال اور جذبۂ حریت کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے چناں چہ سید سلیمان ندوی نے انھیں کشمیر کا اقبال بھی کہا ہے۔

جنتِ کشمیر کے خوب صورت مناظر سے اُنھیں گہری محبت ہے۔ اُنھوں نے کشمیر کی وادیوں، فواروں، مرغزاروں اور جھیلوں کے حُسن کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ وہ مناظرِ فطرت کی عکاسی نہایت ہی دلفریب انداز میں کرتے ہیں۔ اُن کی مشہور نظمیں مثلاً ''صبحِ شالیمار''، ''نمائش گاہ''، ''آزادی''، ''دستک''، ''پری محل'' اور ''امیرا کدل پل'' میں مناظرِ فطرت کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔

شہ زورؔ نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعے اور رباعیاں بھی لکھی ہیں اور ان اصناف پر بھی انھیں پوری دسترس حاصل ہے۔ کالج کی تعلیم کے بعد انھوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے۔ ان کے مشہور ڈرامے ''تقدیر و تدبیر''، ''پاک دامن''،

''پریم مکتی''، ''بی.اے پاس لاش'' وغیرہ ہیں۔ پروفیسر حامدی کشمیری ان کے بارے میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''شہ زورؔ ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ وہ غزل، نظم، قطعہ اور رباعی کی اصناف پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے خوب صورت اور خیال افروز نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں بالعموم حالات کی سنگینی کے تحت زوال اور پسپائی کی المیہ کیفیات ملتی ہیں۔''

پروفیسر عبدالقادر سروری ان کی غزلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی غزل محض روپ کے لحاظ سے غزل ہے۔ باقی اس میں انھوں اپنے عہد کے فنّی اور سماجی شعور کو سمونے کی کوشش کی ہے۔''

شہ زورؔ کی شاعری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے تو حشر میں آخر نقاب الٹنا ہے
جو کام کرنا ہے اک دن وہ آج ہی کرتے

جانے کیوں مرے دل میں جھانکتی ہیں پھر تیری
مدتوں کی یادیں اور مدتوں کی تصویریں

ازل سے ڈھونڈتا ہوں اس نگاہِ نشترِ جاں کو
کبھی جس نے سکھایا تھا تڑپنا قلبِ انساں کو

کشن سمیلپوری: کشن سمیلپوری ۱۹۰۱ء میں جمّوں کے قصّبے سمیلپور میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل سمیلپور میں ہی طے کیے۔ اُن کے چچا پنڈت آ گیا رام پولیس میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے جنھوں نے کشن سمیلپوری کی تعلیمی زندگی کو مکمل کرنے میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ اُنھیں بچپن سے ہی موسیقی سے دل چسپی تھی۔ رقص ونغمہ کے وہ شیدائی تھے۔ یہی وہ اِبتدائی جراثیم تھے کہ جن کی وجہ سے ان کا رجحان شاعری سے بڑھا۔

جب کشن کی جوانی کا آغاز ہوا، تب جمّوں میں شعروشاعری کا ماحول خاصہ گرم تھا۔ یہاں مشاعروں کی روایت پروان چڑھ چکی تھی اور ملک کے نامور شعرا کا ان مشاعروں میں حصّہ لینا گویا ایک خاصا ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا اور یہاں کے شعراء بھی ملک کے دوسرے حصّوں میں مشاعروں میں حصّہ لینے لگے تھے۔ جمّوں میں مشاعروں میں کثیر تعداد میں لوگ شاعروں کا کلام سننے آتے تھے اور دل کھول کر داد بھی دیتے تھے۔ جمّوں کے ایک ایسے ہی مشاعرے میں اُنھوں نے اپنی پہلی غزل پڑھی، جس کے اس شعر کو سامعین نے بے حد پسند کیا ؎

فیصلہ کر زندگی کا اور نفس کا تار توڑ
حشر میں ملیں گے لکھا ہے اگر تقدیر میں

اس زمانے کے مشہور شاعر طغرائی بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ اُنھوں نے اس نوجوان شاعر میں شاعری کے جراثیم کو محسوس کیا اور انھیں اپنا شاگرد بنایا۔ وہ ان کے کلام کی اصلاح کرنے لگے۔ پنڈت ہرکشن حبیبؔ سے بھی وہ اصلاح لیتے رہے۔ اس طرح ان کی شاعری میں نِکھار آتا گیا اور اُن کا شُمار ریاست کے معتبر شعرا میں ہونے لگا۔ اب اُنھیں ریاست کے اچھے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔

کش سمیلپوری نہ صرف ایک شاعر تھے بل کہ وہ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ اُنھوں نے ملک راج صراف

کے ساتھ مل کر ایک ہفتہ وار اخبار ''مشیر'' بھی جاری کیا۔ اس سے پہلے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں ماہنامہ ''جنت'' اور پھر ''ویر'' بھی نکالا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے وہ اس پیشے کو جاری نہ رکھ سکے۔

کشن سمیلپوری نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی اور ان دونوں اصناف پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ وطنیت ان کا محبوب موضوع ہے۔ انھوں نے اپنے آبائی وطن سمیل پور کے قدرتی مناظر کو بھی اور کشمیر کے حسن کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ سمیل پور کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

تالاب کے کنارے کدمبوں کی وہ قطار
سنتوکھ ناتھ جی کی سمادی وہ باوقار
رنگینیوں پہ ناز ہے عظمت پہ ہے غرور
سو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمیل پور

قدرتی مناظر پر اُن کی مشہور نظمیں ''دریائے توی''، ''بٹوت کی ایک شام''، ''خلد زار بھدرواہ، ''اے وادیٔ کشمیر'' وغیرہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اُنھیں فطرت سے گہرا لگاؤ تھا جس کی عکاسی اُنھوں نے اپنی نظموں میں کی ہے۔ بقول پروفیسر حامدی کاشمیری:

''اُن کی آنکھ حسنِ فطرت کی دلدادہ ہے۔ اُن کے بیان میں
روانی ہے۔ وہ خارجی محرکات کے تحت شعر گوئی کی طرف
مائل ہوتے ہیں۔''

کشن سمیلپوری کو جہاں جمّوں کے ڈوگرہ کلچر اور تہذیب سے محبت ہے وہیں وہ یہاں کے ڈوگرہ حکمرانوں کے مداح بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی بعض نظموں میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نظموں کا

مجموعہ ۱۹۶۱ء میں ''فردوسِ وطن'' کے نام سے شائع ہوا۔ان کی غزل روایتی انداز کی ہے۔ان کی غزلوں اور نظمیوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ترا وعدۂ ستم ہی اگر استوار ہوتا
مرا ہر اُداس لمحہ طرب آشکارا ہوتا
مجھے مل گیا وہ نقشِ پا وہیں اے کشن پڑا پڑا رہا
سرِ راہ سینکڑوں کارواں میرے سامنے سے گزر گئے
اگر تم نے کبھی فردوس کا نقشہ نہیں دیکھا
لبِ نسیم و کوثر حور کا جلوہ نہیں دیکھا
اگر جنت کے پھولوں کا حسین دستہ نہیں دیکھا
ارم کی وادیوں میں دودھ کا پردہ نہیں دیکھا
تو میرے دوست کچھ دن کے لیے کشمیر آجاؤ

مانسر جھیل کے بارے میں یہ اشعار دیکھیے:

یہ منظرِ جمیل ہے، قدرت کا شاہکار
شاہ و فقیر جس پہ دل و جاں سے ہیں نثار
دیکھے تو کوئی جھیل سے کہسار کا پیار
آغوش میں لیا ہے اسے ہو کے بیقرار
ساحل پہ ایک ایک نظارہ ہے پُر فسوں
پاتا ہے اس جگہ دلِ مجروح بھی سوں

رسا جاودانی: رسا کا شُمار ریاست کے ممتاز اُردُ وشعرا میں ہوتا ہے۔آپ کا اصلی نام عبدالقدوس ہے لیکن علمی حلقوں میں رسا جادوانی کے نام سے شہرت حاصل کی۔آپ کے والد کا نام خواجہ منور جو دیوتھا جو اپنے زمانے کے بھدرواہ کے ایک بہت بڑے تاجر تھے اور علم دوست بھی ۱۹۰۱ء میں رسا جادوانی پیدا ہوئے۔

رسا جاودانی نے اِبتدائی تعلیم بھدرواہ کے مقامی اسکولوں میں حاصل کی۔منشی فاضل اور منشی عالم کے امتحانات پنجاب یونی ورسٹی سے پاس کیے۔معلّمی کے پیشے کو اختیار کیا اور ساری عمر درس وتدریس کا کام انجام دیتے رہے۔۱۹۵۵ء میں نوکری سے ریٹائر ہوئے۔

رسا جاودانی کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ابھی ساتویں جماعت کے طالب علم ہی تھے کہ شعر کہنے شروع کر دیے۔اِبتدا میں ان کا کلام ''رنبیر'' اور ''مخزن'' لاہور میں چھپتا رہا۔حفیظ جالندھری، علامہ سیماب اکبرآبادی وغیرہ جیسے شعراء سے رسا جاودانی کے گہرے مراسم تھے۔جمّوں میں جب مشاعروں کا آغاز ہوا تو وہ بھی اِن مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔سامعین ان کے اشعار کو بے حد پسند کرتے۔نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی شاعری کی شہرت ملکی سطح پر بھی ہوگئی اور پھر انھوں نے کئی کل ہند مشاعروں میں بھی شرکت کی۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''لالہ صحرا'' ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ ''نظمِ ثریا'' ۱۹۶۲ء میں۔اُنھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔اُن کی غزلیں سادہ ہیں جو خواجہ میر درد اور مصحفی کی غزلوں کی یاد دلاتی ہیں۔شاعری کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں رموزِ فن پر دسترس بھی حاصل تھی۔ایک طرف جہاں اُن کی غزل میں عشقیہ موضوعات ملتے ہیں تو دوسری طرف غزلیں غور وفکر کی دعوت بھی دیتی ہیں۔پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''غزل سے رسا کو طبعی مناسبت ہے اور اسی صنف میں ان
> کی طبعیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی

بحریں انھیں مرغوب ہیں اور اپنے سادہ اندازِ اظہار میں میر
تقی میرؔ جیسا اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن کی غزل کا ایک
نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں رومانیت کم لیکن غور وفکر کی
پرچھائیاں زیادہ نمایاں ہیں..... اُن کی بعض غزلوں
میں نظم کا سا تسلسل پایا جاتا ہے۔''

اپنی نظموں میں انھوں نے مناظرِ فطرت کی عکاسی کی ہے۔ایسی نظموں میں ''بیتے دِنوں کی یاد''، ''برف باری'' اور ''ساون'' کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

مری شاعری میری ساحری ہے خیالِ اُلفت سے بھری
نہیں یہ رجز کی فسوں گری مگر آشتی کا پیام ہے

آپسی بھائی چارے اور قومی یکجہتی پر بھی زور دیتے ہیں ؎

مجھے ایسے مذہب سے رسؔا نہ ہے واسطہ نہ ہے ربط
جہاں خونِ آدم حلال ہے اور سرخ پانی حرام ہے

پروفیسر حامدی کاشمیری اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رسؔا جاودانی کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ
سے ایک تخیلی صورتِ حال کو خلق کرتے ہیں۔ یہ کمالِ شاعری
ہے اور میرؔ اور غالبؔ جیسے قدآور شعراء کا طرۂ امتیاز ہے۔''

رسؔا جاودانی کی شاعری کی سادگی، روانی اور اختصار مندرجہ ذیل اشعار سے جھلکتی ہے :

وہ کون سا سِتم ہے جو توڑا نہ دوست نے
ہم سے سلوک کیا نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے
تیری فرقت میں تجھ سے ملنے تک
تیرے پیغام کا سہارا ہے
کہنے کو رسؔا سب کہتے ہیں ان تک تو رسائی ہو نہ سکی
کیا نام سکندر رکھنے سے جب بخت سکندر ہو نہ سکا
ہے مے سے ہمیں پرہیز رسؔا، پرہیز کہاں تک کوئی کرے
ساون کی گھٹائیں چھاتی ہیں تو اکثر پیتا رہتا ہوں

رسؔا جاودانی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ریاسی کلچرل اکیڈمی نے انھیں خلعت سے نوازا۔اس کے علاوہ وہ ریاستی کلچرل اکیڈمی کے مرکزی کمیٹی کے رُکن بھی رہے۔ اس کے علاوہ بھارتیہ گیان پیٹھ کلکتہ کی Advisory Committee کے ممبر بھی رہے۔اُنھوں نے کشمیری زبان میں بھی شاعری کی۔کشمیری کلام کے بھی دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ناقدین نے اُنھیں کشمیری غزل کا غالبؔ بھی کہا ہے۔رسؔا جاودانی کا انتقال ۲۷ مئی ۱۹۷۹ء کو بھدرواہ میں ہوا اور وہیں اُنھیں سپردِ خاک بھی کیا گیا۔

نشاطؔ کشتواڑی: نشاطؔ کشتواڑی ریاست کے ایک بزرگ شاعر ہیں۔۱۹۰۹ء میں کشتواڑ میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان آج سے تقریباً ۲۰۰ سال پہلے اسلام آباد، کشمیر سے ہجرت کر کے کشتواڑ آیا اور یہیں کا ہو کر رہا۔

نشاطؔ کشتواڑی کے والدین کی مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔اس لیے انھیں تعلیم کا سلسلہ آٹھویں جماعت سے پہلے ہی منقطع کرنا پڑا۔بچپن سے ہی انھیں کتابیں اور اخبار پڑھنے کا شوق تھا جو ابھی بھی جاری ہے۔گھر پر ہی مختلف قسم کی ادبی، مذہبی اور تاریخی کتابیں پڑھتے رہے۔مولانا حبیب پونچھی سے عربی اور فارسی کتابیں پڑھیں۔وہ اُن دِنوں

کشتواڑ میں بچّوں کو مذہبی تعلیم دینے کے علاوہ وعظ وتبلیغ بھی کرتے تھے۔اُنھوں نے کشمیر یونی ورسٹی سے ادیب عالم اور ادیب فاضل کے لیے بھی تیاری کی لیکن صحت کی خرابی اور مالی مشکلات کی وجہ سے امتحان میں حصّہ نہ لے سکے۔۱۹۳۸ء میں کشتواڑ میں کتابوں اور اسٹیشنری کی دُکان کھولی۔ وہاں بھی انھوں نے بعض کتابوں کا مطالعہ کیا۔نشاطؔ کشتواڑی نوجوانی کے دوران مسلم کانفرنس سے وابستہ رہے۔اُنھوں نے فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔۱۹۴۷ء کے بعد نیشنل کانفرنس میں چلے گئے لیکن پھر کچھ عرصہ بعد سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی۔وہ نامہ نگار کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک کئی اخباروں سے منسلک رہے۔

نشاطؔ صاحب کو شعروشاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا لیکن ۱۹۳۳ء میں اُن کی شاعری کا باقاعدہ آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب اُنھوں نے اپنے استاد مرحوم مولانا پونچھی کی مدح میں قصیدہ لکھا۔آہستہ آہستہ وہ غزل اور دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔۱۹۳۵ء میں عشرتؔ کاشمیری کے ساتھ مل کر بزمِ ادب کشتواڑ کا قیام عمل میں لایا۔وہ اس بزم کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔۱۹۴۱ء میں اُنھوں نے علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کی ایک ولولہ انگیز نظم کسی اخبار میں پڑھی۔اس نظم نے نشاطؔ کو بے حد متاثر کیا۔اُنھوں نے اپنی نظم ''کشمیر کا مزدور'' علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کو بھیجی اور اُن سے یہ درخواست کی کہ وہ اُن کے اُستاد بنیں۔اس کے بعد نشاطؔ صاحب نے سیمابؔ کو اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بھیجنی شروع کر دیں۔اُن کی شاگردی میں رہ کر نشاطؔ صاحب نے شاعری کے فن سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کی۔۱۹۴۲ء کے بعد نشاطؔ صاحب کا کلام ملک کے مختلف رسائل اور جرائد میں چھپنے لگا۔۱۹۴۲ء میں اُن کی پہلی تصنیف ''مظلومِ کربلا'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ مجموعہ دس نظموں پر مبنی ہے۔اس میں شہدائے کربلا کے مرثیے اور مدحیہ منظومات شامل ہیں۔اِسی کتاب کو انھوں نے مزید ترمیم واضافے کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں ''تحفۂ پنجتن'' کے نام سے شائع کیا۔ان نظموں سے نشاطؔ صاحب کی حضرت امام حسین علیہ اسلام کے تئیں محبت کا پتہ چلتا ہے۔

''مناقب الاولیا'' نشاطؔ صاحب کی نعتوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ان کی

والہانہ عقیدت، جو اُن کے حساس دل کے اندر حضرت رسولِ اکرم اور اولیائے کرام کے لیے موجزن ہے۔ اس میں کشمیری اور اُردُ و دونوں نعتیں موجود ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں اُن کا ایک اور مجموعہ ''نعتِ سرکارِ دو عالمؐ'' منظرِ عام پر آیا۔ اس میں جہاں مختلف قسم کی نعتیں موجود ہیں وہیں دوسری طرف اصلاحی اور قومی نوعیت کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ شاعری کے تمام اصولوں سے واقف ہیں۔ ان کی نعتوں میں جذبۂ عشق نبی قابلِ داد ہے۔ زبان صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے در پہ اک بے نوا یا الٰہی　　اُٹھاتا ہے دستِ دعا یا الٰہی
تو ستار ہے اور غفار بھی ہے　　میں بندۂ پُر خطا یا الٰہی
دعائیں میری سُن لے فریاد سُن لے　　طفیل شہِ انبیا یا الٰہی

.....

تیرے وصف کیا کروں رقم یا محمد　　ہے عاجز زبان اور قلم یا محمد
نبی کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہوگا　　تیرے مرتبے کی قسم یا محمد

نشاطؔ صاحب کا غزلوں اور نظموں پر مشتمل مجموعہ ''بادۂ وطن'' ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں زیادہ تر نظمیں قومی یکجہتی سے متعلق ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں فطرت کے نظاروں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ نظم ''وادیٔ کشتواڑ'' میں اُنھوں نے اونچے اونچے پہاڑوں، خوب صورت جنگلوں اور خدائی نظاروں کی بہترین عکاسی کی ہے:

کس غضب کی سیر گاہیں ہیں تیری
دید کے قابل مناظر بھی کئی
زعفران تیرا بھی کیا مشہور ہے
آدمی تعریف پر مجبور ہے

اس کی شہرت دہر میں مشہور ہے
سب کی نظروں میں یہی منظور ہے

نشاطؔ صاحب نے وقتاً فوقتاً بچّوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں جوانھوں نے ۱۹۸۴ء میں ''تحفۂ اطفال'' کے عنوان سے شائع کیں۔ بچّوں کی دل چسپی کی چیزیں مثلاً کرکٹ، کبڈی، کہانیاں، سائنس کی دُنیا وغیرہ موضوعات پر اُنھوں نے بے شُمار نظمیں لکھی ہیں۔ کبڈی کے کھیل کا نقشہ انھوں نے یوں کھینچا ہے :

آ و کبڈ ی کھیلیں بھیا کھیل ہے سیدھا سادھا
حامد، ناصر، چونی، رادھا آو کبڈی کھیلیں بھیا
آ و کبڈ ی کھیلیں بھیا

''گولڈن کرکٹ ٹیم'' میں وہ کرکٹ کے بارے میں کہتے ہیں:

محبو ب کھیل ا پنا کرکٹ ہے نام جس کا
ہر سمت ا س کا چر چا شہرت ہے اسی کی ہر جا
کر کٹ ہے کھیل ا پنا
د ل ہے ا سی پہ شید ا

نشاطؔ صاحب کا تمام اُردُو کلام ماسوائے نعت ومنقبت ''تصویرِ خیال'' کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ ۴۶۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں غزل، نظمیں، طنز ومزاح سب کچھ موجود ہے۔ اس کتاب کو کلچرل اکیڈمی کی جانب سے ۱۹۹۰ء میں بہترین کتاب کا انعام بھی ملا۔ اکیڈمی نے انھیں خلعت فاخرہ سے بھی نوازا۔

نشاطؔ کشتواڑی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزلیات اور نعتیں بھی بے حد مقبول ہوئیں۔ سادگی اور سلاست کے علاوہ روانی ان کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ اُن کے کلام میں آمد ہی آمد ہے۔ روایت کے ساتھ ساتھ

اُن کی شاعری میں جدت پسندی بھی ہے۔''تصویرِ خیال'' میں ۵۰ کے قریب غزلیں شامل ہیں:

گلستاں میں بلبل کے نغمے نئے ہیں ترانوں میں اس کے نیا ہی اثر ہے
نئے قافلوں کے نئے راہبر ہیں نیا ہی سکندر نیا ہی خضر ہے

.....

کوئی ترسے کوئی ہو مست ساقی یہ تیرے میکدے کا ڈھنگ کیا ہے
شناسا ہی سمجھ سکتے ہیں اس کو کہ گوہر چیز کیا ہے سنگ کیا ہے

نشاطؔ اپنی شاعری میں طنز و مزاح کے گل بھی کھلاتے ہیں۔ان کی طنزیہ اور مزاحیہ نظموں میں ''ممبری''، ''الیکشن''، ''چاول نہیں ملتے''، پے کمیشن''، ''سرسوں کا تیل''، ''ماڈرن غزل'' کافی مشہور و مقبول ہیں۔نظم الیکشن میں کہتے ہیں:

چلو آج پھر ہم الیکشن لڑیں گے لڑیں گے تو پیہم الیکشن لڑیں گے
الیکشن کی جنت میں داخل جو ہوں گے وہی ابن آدم الیکشن لڑیں گے
اسی کے لیے خاک چھانی ہے ہم نے ترستے ہیں کب ہم الیکشن لڑیں گے
تمہیں کیا خبر اولڈ فیشن بزرگو یہ ہے دورِ ایٹم الیکشن لڑیں گے
سیاست کی تھیلی مداری کا تھیلا مسلم مسلم الیکشن لڑیں گے
سلامت ہو فرقہ پرستی کا پرچم اس کو لیے ہم الیکشن لڑیں گے

نشاطؔ کشتواڑی کشمیری میں بھی شاعری کرتے ہیں۔کشمیری کے دو مجموعے کلام بھی شائع ہو چکے ہیں۔کشمیری میں رسؔا جاودانی کی طرح نشاطؔ کے اشعار بھی رومانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔نشاطؔ کشتواڑی کی عمر اس وقت لگ بھگ ۹۱

سال ہے۔ وہ اب بھی اُردُو شعروادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ پروفیسر ظہور الدین اپنی کتاب The Development of Urdu Language in the Jammu Region نشاطؔ صاحب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''جناب غلام رسول نشاطؔ کشتواڑی حضرت سیمابؔ اکبر آبادی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ غزل، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، مثنوی اور قطعہ وغیرہ یعنی ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔.....بچّوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ نشاطؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوب صورتی یہ ہے کہ اس سے کشتواڑ کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے۔ نشاطؔ اب شاعر کی حیثیت سے اس منزل تک جا پہنچے ہیں جہاں دوسرے لوگوں نے ان سے بخوبی استفادہ کرتے ہوئے اپنے لیے نئی راہیں متعین کی ہیں۔''

اکائی نمبر 13: جموں وکشمیر کے نامور شعراء (رسا جاودانی، عرش صہبائی، میر غلام رسول نازکی، حکیم منظور)

رسا جاودانی، عرش صہبائی، میر غلام رسول نازکی اور حکیم منظور ریاست جموں وکشمیر کے اہم اور سرکردہ اُردو شعرا ہی نہیں بلکہ ریاست جموں وکشمیر کی اُردو شاعری کے معیار ہیں۔ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص شعری پیرائے میں اُردو شاعری کی زلفِ گرہ گیر سنوارتے رہے ہیں۔ان ہی معتبر تخلیق کاروں کی بدولت ریاست میں اُردو شاعری کے دبستان میں ایک شعراء کی کھیپ تیار ہوئی ہے جس نے یہاں کے اُردو شاعری کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔رسؔا کا ذوق رسا، نازکی کی نزاکت امیز شعری روایات بلا مبالغہ ریاست کے نووارد شعراء کے لیے مشعلِ راہ کا کام کریں گی اور کر رہی ہیں۔ہم یہاں پر مذکورہ شعرا پر تفصیلی بحث کریں گے۔

رسؔا جاودانی: رسؔا جاودانی کا اصلی نام عبدالقدوس اور رسؔا تخلص ہے۔1901ء میں ان کی ولادت بھدرواہ میں ہوئی۔رسؔا کے بزرگوں نے سکھوں کے عہدِ حکومت میں انت ناگ کشمیر سے ہجرت کر کے تجارت کی غرض بھدرواہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ان کے والد خواجہ منور تاجر تھے لیکن وہ فارسی علم وادب سے اچھا شغف رکھتے تھے۔رسؔا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔بعد میں اپنے ذاتی مطالعہ سے پنجاب یونی ورسٹی سے منشی ، فاضل کا امتحان پاس کیا۔انگریزی تعلیم گھر پر حاصل کی اور درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ انگریزی تعلیم گھر پر حاصل کی اور درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ایک لمبے عرصے تک وہ اُردو اور فارسی پڑھاتے رہے۔ آخر کار 27 رمئی 1979ء میں انتقال کر گئے۔ رسؔا کے گھر میں علمی ماحول تھا جس کے سبب صغرسنی سے ہی شعروشاعری کی طرف راغب ہوئے۔شعر کہنے کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقیت میں بھی دلچسپی تھی۔جس نے ان کی شاعری میں تخلیقی زبان کے ساتھ نغمگی اور غنایت بھی پیدا کر دی۔

رسؔا نے ہمیشہ اپنے ذوق رسا کو اپنا استاد مانا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب کلام میں ایسی پختگی

اور کلاسیکیت کی شان پیدا ہوئی کہ ان کے کلام میں جہاں میرؔ کا گداز ہے تو لسانی اعتبار سے غالبؔ کی ترکیب سازی کی چستی بھی موجود ہے اور اقبال کے کلام کی نغمگی اور غنائیت بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ شاید اس فنی پختگی کی وجہ سے ریاست کے بڑے شعراء میں ان کا شمار ہی نہیں ہونے لگا بلکہ قابل تقلید بھی ٹھہرے۔

ان کے دو شعری مجموعے لالہ صحرا 1948ء۔ نظم ثریا۔1962ء میں شائع ہو کر اپنا بلند مقام بنا چکے ہیں۔ رسؔا نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں نظم، غزل، قطعات، رباعیات، گیت، مسدس، نعت اور حمد وغیرہ سب اصناف موجود ہیں۔ ان کے کلام میں اُردو کے اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ رسؔا نے کمال ہنرمندی سے اپنے کلام میں جدید طرزِ فکر کو شامل کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بنیادی طور پر روایت پسند ہیں لیکن بعض غزلیں انہوں نے نئے انداز اور جدید اسلوب میں کہی ہیں۔ اگرچہ رسا کے کلام سے مجموعی طور پر ان کے جودتِ طبع کا انداز ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور اسی صنف میں ان کا خاص جوہر نمایاں بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی اکثر غزلوں میں چھوٹی بحروں کو برتا ہے جن میں موضوع کے اعتبار سے فکر اور سوچ کی گہرائیاں نظر آتی ہیں۔ رسؔا کی غزل میں حُزن و ملال کی ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ اس ملال کو اپنی شاعری پر غالب نہیں ہونے دیتے۔ ان کے اشعار میں تجربات و مشاہدات اور احساسات پر مبنی سوز دروں کی ایک ہلکی سی سلگتی ہوئی آگ کا احساس ہوتا ہے جس کا اثر ان کے قاری کو تڑپا دیتا ہے۔

رسؔا کے یہاں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ کلامِ رسؔا کے مطالعے سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ محض اپنی بیتی نہیں سُناتے بلکہ ایک وسیع تناظر میں جگ بیتی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ وہ حسن و عشق کے علاوہ مناظر فطرت، فطرتِ انسانی، مشترکہ تہذیب اور حب الوطنی کے موضوعات کو بھی اپنی شعریات میں ڈھالتے ہیں۔ چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

میری شاعری میری ساحری ہے خیالِ اُلفت سے بھری
نہیں یہ رجز کی فسوں گری مگر آشتی کا پیام ہے

کلام اپنا پیامِ آشتی ہے
جہاں میں انقلاب آئے نہ آئے

تُو مجھ سے جھوٹا ہی کر تو وعدہ مجھے تیرا اعتبار ہوگا
کہ راست مانندِ جھوٹ تیرا بھی مجھ کو وجہہ قرار ہوگا

جوشِ جنوں کا عالم رہے رہے نہ رہے
زُلفِ مشکیں برہم رہے نہ رہے

سرو سے تجھ کو دے تو دوں تشبیہ
حق نے تجھ کو مگر خرام دیا

تیرے چہرے کے سامنے ہم نے
آئینہ آب آب دیکھا ہے

میر غلام رسول نازکی: میر غلام رسول نازکی کشمیر میں اُردو شعر وادب کے معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ 16 مارچ 1910ء کو بانڈی پورہ میں پیدا ہوئے۔ گھر میں علمی ماحول تھا۔ ان کے خاندان میں عربی اور فارسی کے عالم وفاضل گذرے ہیں۔ ان کے والد گرامی کو عربی اور فارسی پر خاصی دسترس حاصل تھی۔ نازکی نے اپنے والد سے کسبِ فیض

کرتے ہوئے پرائیویٹ حیثیت سے ادیب، فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ علاوہ اس کے انگریزی یعنی عصری اسکول و کالج میں بی۔اے کے درجے تک تعلیم حاصل کی۔ گھر میں علم وادب کے پاکیزہ ماحول سے انہیں طفلانہ زمانے سے ہی شعروشاعری کی طرف طبیعت مائل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے ہی اُن کا کلام مختلف ادبی رسائل میں چھپتا رہا۔ 1949ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''دیدۂ تر'' منظرعام پر آیا۔ یہ شعری مجموعہ اُن کی غزلیات، نظموں اور قطعات پر مشتمل ہے۔

میر غلام رسول نازکی وادیِ کشمیر کے کہنہ مشق شاعروں میں سے تھے۔ اُردو شعروشاعری میں اظہار کی نزاکتوں کے شعر، بیان پر قدرت نے انہیں اساتذہ کے مرتبہ پر فائز کر دیا۔ اساتذہ کی روایات ورسومیات کے وہ امین رہے ہیں۔ اسی لیے صنفِ غزل ہی زیادہ تر ان کے شعری تجربات کا مرکز رہی ہے۔ بحیثیت عمومی ان کی غزل نئے عہد کی غزل ہے۔ جس میں ہمارے عہد کا شعور شامل ہے۔ میرؔ کی سادہ بیانی، اقبال کا جوش اور غالب کی مضمون آفرینی کا اثر کشمیر کے شعراء میں سے نازکی کے یہاں نظر آتا ہے۔ نازکی کی شاعری میں ایک دردمند دل کی پکار ہے۔ نازکی کے یہاں غمِ زندگی کی اہم ترین حقیقت سے عبارت ہے۔

؎ محبت زندگی اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہوکر غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے

اپنی غزلیہ شاعری بعض مقامات پر نازکی طنز کے ذریعہ اپنی انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
شیراز کی شادابی کشمیر کی رعنائی
محبت میں ایسے بھی لمحات آئے
نہ میں نے صدا دی نہ تُم نے پکارا

غلام رسول نازکی کی روایت کے علم بردار ہیں اور جدید دریافتوں اور علم وآگہی کے عروج سے بھی بھرپور وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر کلام رسائل میں چھپا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''متاعِ فقیر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کا بیشتر کلام روحانی تجربات کا آئینہ دار ہے۔ نعت بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کہی ہے لیکن ان کی نعت گوئی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استادانہ رنگ موجود ہے۔

تمہارے ساتھ ہر لمحہ نغمہ ٔ جبریل
وہ نغمہ جس میں معانی کی روح تھی تحلیل

عرش صہبائی: ریاست جموں وکشمیر میں جن شعراء کا کلام معتبر مانا جاتا ہے ان میں عرش صہبائی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ عرش صہبائی کی ولادت ۳ دسمبر ۱۹۳۰ء کو ضلع جموں کی ایک تحصیل اکھنور کے ایک چھوٹے سے گاؤں سیری پلائی باختن میں ہوئی۔ عرش کا اصل نام ہنس راج ابرول اور تخلص عرش صہبائی ہے۔ عرش صہبائی کے خاندان بزرگ ضلع ادھم پور کے ایک گاؤں جب کے رہنے والے تھے۔ ان کے پردادا ذی شعور بزرگ تھے۔ گاؤں کے لوگ اصلاح ومشورہ لینے کے لیے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔

عرش صہبائی ابھی سات سال کے ہوئے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اب ساری پرورش کی ذمہ داری ان کے والد پر آن پڑی۔ والد نے 1937ء میں سات سال کی عمر میں عرش صہبائی کو کچی چھاؤنی پرائمری اسکول جموں میں داخل کروایا۔ 1948ء میں رنبیر ہائی اسکول جموں سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ 1949ء میں گیارہویں جماعت کا امتحاس پاس کیا اور 1950ء میں ایف۔ اے کے امتحان دینے سے پہلے ہی کالج کو خیر آباد کہہ دیا۔ عرش صہبائی نے تعلیم اس لیے چھوڑ دی کہ ان کو بچپن میں ہی شاعری کا چسکا لگ گیا تھا۔

عرش صہبائی کا باقاعدہ دور 1950ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں جوانہوں نے شعر کہے ان کا مجموعہ 1958ء میں ''شکستِ جام'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس کی پذیرائی اُردو حلقوں میں خوب ہوئی۔ اسی زمانے کا ان

کاایک مشہور شعر ہے۔

؎ بادِ خزاں رہے سہے تنکے بھی لے اُڑی
دے کر حزیں کو تسلی بہار کی

عرش صہبائی نے اُردو شاعری کی تقریباً ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے جن میں غزل، نظم، قطعہ اور دوہا خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ عرش صہبائی بہت ہی پُر گو ہیں ابھی تقریباً ان کے ڈیڑھ درجن سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس شعری انبار میں اگر ایمانداری کے ساتھ دیکھا جائے تو ان مضامین کی جدت ضرور کہیں کہیں مل جاتی ہے لیکن سارے مجموعوں میں مجموعی طور پر خیال کی تکرار ہے۔ عرش صہبائی روایتی شاعری کے ڈکشن میں شعر کہتے ہیں۔ ہیئت میں تو کوئی جدت نہیں ہے لیکن مضامین میں کہیں کہیں جدت کا احساس ہوتا ہے۔ یوں تو انہوں نے نظم اور دوہے بھی کہے ہیں لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے جس میں ان کے جوہر نکل کر آتے ہیں اور اپنی انفرادیت کے قائم کرنے میں اہم ہیں۔ زبان کے حوالے سے بہت ہی محتاط ہیں۔ عرش کے یہاں زبان کا کلاسیکی رچاؤ موجود ہے۔ لفظ کی دروبست اور محاورہ وغیرہ پر خاص نظر رکھتے ہیں لیکن ان کی شعری زبان میں تخلیقی زبان کے عنصر کی کمی ضرور کھلتی ہے۔ لیکن اُن کا کلام اُستادانہ شان رکھتا ہے۔ عرش صہبائی کے یہاں تقریباً ہر طرح کے مضامین ملتے ہیں۔ ان کے مضامین میں جدت اور نُدرت بھی ہے۔ حُسن و عشق سے لے کر غمِ روزگار تک اور زمانے کی طوطا چشمی سے لے کر خودداری تک کے موضوعات کی موجودگی اپنی اور کھینچتی ہے۔ ان کے کلام سے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

؎ زندگی ! تو عمر بھر برہم رہی ہم سے مگر
جس طرح چاہا ہے ہم نے اُس طرح چاہے گا کون

دِل تو کیا چیز ہے ہم روح میں اُترے ہوتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح
عرشؔ بے باکی وحق گوئی ہے مذہب اپنا
ہم نہ بدلیں گے کبھی وقت کی چالوں کی طرح

ہم نے پھیلایا نہیں ہرگز دستِ سوال
ہم بزرگوں کی دُعا سے پھولتے پھلتے رہے

عرشؔ اس جمہوریت کے دور میں
عام انسان ہے بہت سہما ہوا

عرش صہبائی نے اپنے کلام خاص طور پر غزل میں سماجی نابرابری، معاشی استحصال، معاشرتی زبوں حالی، فرقہ پرستی، تنگ نظری، انسانی اقدار، نفسانفسی، حرص وہوس اور سیاسی ظاہر داری وغیرہ پر خوب لکھا ہے۔ عرش صہبائی کے مندرجہ ذیل شعری مجموعے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔

'شگفتِ گُل، انجم کدہ، صلیب، اسلوب، عکسِ جمال، سائے تیری یادوں کے، اور شبنم تیری یادوں کی۔

حکیم منظور: حکیم منظور ریاست کے جدید شعرا کی صفِ اول میں نمایاں اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔ حکیم منظور کی ولادت 14 اکتوبر 1937ء کو سری نگر کے ایک مشہور تاریخی محلّہ آخون صاحب گوجوارہ میں ہوئی۔ حکیم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُس وقت 1955ء میں جب وہ کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔

حکیم منظور نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ 1956ء میں ان کی کہانیاں مارٹنڈ اور کشمیر جیسے مقامی اخباروں کے علاوہ دہلی کے ہفتہ روزہ ''چترا'' میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ شاعری کا باضابطہ آغاز انہوں نے 1964ء میں کیا۔ ان کے اب تک کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''ناتمام'' (1977ء)، 'لہولمس چنار' (1982ء)۔ برف رتوں کی آگ (1990ء)، خوشبو کا نام نیا (1990ء) نظموں کا مجموعہ ''پھول شفق آنگن کے'' (1993ء) اور شعری آسمان (1997ء) قابل ذکر ہیں۔ یہ سارے شعری مجموعے ایسے ہیں جو حکیم منظور کی انفرادیت کو قائم کر کے اُردو شعر و ادب میں ان کی قدر کو متعین کرتے ہیں۔ ''ناتمام'' سے لے کر ''شعری آسمان'' تک حکیم منظور نے جو شعری سفر طے کیا ہے۔ وہ تجربے اور اظہار، لفظ و صفی اور ہیئت و موضوع ہر اعتبار سے ایسے جہانِ تازہ کا سفر ہے جو خود حکیم منظور کا تخلیق کردہ ہے۔

حکیم منظور ایک نئی اور منفرد آواز بن کر اُردو دُنیا میں وارد ہوئے۔ ان کے تجربات اپنے اختصاص اور حسین و پُر جمال جہان کی پیداوار ہیں۔ ان کی غزلوں میں اظہار و ترسیل کو موثر ترین بنانے والے فکر و احساس کی تازگی اور انوکھا پن نمایاں ہے۔ زبان و بیان میں خود رومی کی سی کیفیت ہے جس کے سبب غزل میں سادگی اور سلاست کے عناصر موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں ایسے کثیر الفاظ کا برتاؤ ہے جو سرزمینِ کشمیر کے مظاہر فطرت اور کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی قسم کی مقامی شناخت کئی شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ خون، برف، ہاتھ سرد، میدان، پتھر، آئینہ، پہاڑ، پیڑ، ہوا، سورج، نقش، رنگ وغیر الفاظ حکیم منظور کی شاعری کو استعاراتی وسعت دیتے ہیں۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

کچھ تو سورج نے بھی اپنی بند مٹھی وا نہ کی
بند کچھ ہم پر بھی اپنے دِل کے دروازے رہے

خون برف ، ہاتھ سرد، نگاہیں تمام خون

میدان بے حریف کالشکراداس ہے
دے جو سکتا تھا کئی رنگ کئی موڑ اسے
وہی کردار کہاں میری کہانی سے گیا

یہ کوئی دوست نہیں ، راستے کے پتھر ہیں
مگر بشرط رفاقت یہ کتنے بہتر ہیں

باہر ہزار جشن ہے ، اندر اداس ہے
پتھر تراشتا ہوا آذر اُداس ہے

اکائی نمبر 14:   جموں وکشمیر میں اردو افسانوی ادب

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان کی تشکیل وتوسیع کی شروعات کوئی سوٴ سوا سو سال پہلے ہوئی۔ ڈوگرہ عہد سے قبل کشمیر میں افغانوں اور سکھوں کی عمل داری رہی اور اہلِ کشمیر برسوں غلام در غلام رہے۔ اِس زمانہ میں یہاں فارسی زبان اور ادب کا چلن رہا۔ جموں وکشمیر کے لوگوں نے یہاں بھی اپنی ذہانت اور ذکاوت کا ثبوت فراہم کر کے اِس زبان میں قابلِ قدر سرمایہ پیدا کیا۔ لیکن جب ڈوگرہ عہد کا آغاز ہوا اور مہاراجہ گُلاب سنگھ (۱۸۴۶ء۔۱۸۵۶ء) نے برطانوی حکومت سے کشمیر کو خریدا۔ ریاست جموں وکشمیر میں ڈوگرہ حکومت کا قیام عمل میں لایا۔ تب سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ کشمیر سرکار کے تعلقات بھی قائم ہوئے جس کے نتیجے میں بعض لوگوں کا ریاست سے باہر آنا جانا ناگزیر بن گیا۔ عوامی سطح پر بھی وسائلِ معاش کی تلاش اور تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے بھی اِن تعلقات میں اِضافہ ہوا۔ اِس اِختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہر جانے والے سیلانی اپنی فارسی دانی کی بدولت بیرون ریاست مروجہ اُردو میں شد بد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصے تک نقیبوں کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بُلا کر اپنے دربار میں اِس غرض کے لیے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ بھی ڈوگرہ دربار میں مغلیہ جاہ وجلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اُس کی آمد کا اعلان مغلئی انداز سے کیا جاتا تھا۔ اِن نقیبوں کے ساتھ اُن کے پُورے پُورے خاندان بھی تھے جن کی بول چال کی زبان اُردو تھی۔ اِس طرح سے بھی اُردو زبان کا عمل دخل شروع ہوا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جموں وکشمیر کی آبادی کا خاصا حِصّہ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے دوران ہندوستان کے دُوسرے حصّوں میں ہجرت کرنے پر مجبُور ہو گیا تھا۔ اِن میں سے اکثر خاندان وہیں کی خاک میں جذب ہو گئے لیکن اُردو زبان کی تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر اُنھوں نے شعر وادب کے ایسے نادر گُل بُوٹے سجائے جن کا اپنا الگ مقام ہے۔

ڈوگرہ سلطنت کے بانی مہاراجہ گُلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی۔لیکن خطۂ جموں کے بیشتر علاقوں میں ڈوگری زبان کا بولا بالا تھا جولسانی اعتبار سے پنجابی اور اُردوٗ کے قریب ہے۔اِس لیے اُردوٗ زبان یہاں پر اپنے ادبی خدوخال مرتب کرسکی۔مہاراجہ رنبیر سنگھ(۱۸۵۷ء۔۱۸۸۵ء) کا زمانہ مقابلتاً امن وسکون کا زمانہ تھا۔مہاراجہ کو نئے علوم وفنون سے دِل چسپی تھی۔ اِس لیے نئے علوم کے ساتھ نئی تعلیم کی ترویج میں اس نے کافی دِل چسپی کا اِظہار کیا۔اپنی رعایا کو مغربی علوم وفنون سے آشنا کرنے کے لیے اس نے اپنے دربار میں عالم اور فاضل جمع کیے۔ اِن میں بیشتر فارسی کے عالم تھے۔ یہ فارسی زبان بولتے اور لکھتے تھے۔مہاراجہ کا وزیراعظم دیوان کرپارام کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ اُردوٗ زبان میں بھی دست رس رکھتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاست کی اِنتظامی صورتِ حال پر اُردو میں رپورٹیں مُرتب کروائیں اور اِن کی اشاعت کا اہتمام کیا۔اِن رپورٹوں کو ریاست میں اُردو نثر کے اِبتدائی نمونے کہا جاسکتا ہے۔

یہاں اِس بات کی طرف اِشارہ کرنا ضروری ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جب حکومت کی عنان سنبھالی اور اِبتدائی برسوں کی مُشکلات کے بعد حکومت میں استحکام پیدا ہوا تو مہاراجہ کو علم وادب کی اشاعت کا خیال آیا۔ چنانچہ مہاراجہ نے جموں میں ایک سنسکرت کالج قائم کیا۔اِس کے علاوہ ایک لائبریری اور ایک دارالترجمے کا اہتمام بھی کروایا۔ اِس دارالترجمے کے توسط سے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع ہوئیں اور بہت سے مسودے ڈوگری، ہندی اور اُردوٗ میں ترجمہ ہوئے۔اِس اِدارے کے زیرِ اہتمام ریاستی نظم ونسق سے متعلق کئی رپورٹیں مُرتب ہوئیں۔۱۸۸۲ء۔۱۸۸۳ء کے دوران تیار کی ہوئی ایک رِپورٹ ذیل میں درج ہے:۔

> ''۴۵۰۲ روپیہ اُجرت ترجمہ اِس سال میں صرف ہوا اور سال حال میں
> کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری اور شاستری سے بھاشا اور عربی
> سے اُردوٗ میں ترجمہ ہوئی ہیں، ختم ہوئی ہیں۔۔۔۔۔''

اِس اِقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کی کتابیں جو عربی یا دُوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل ہوئی تھیں اُن کو باضابطہ طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اِس عہد کے کئی مسودات ملتے ہیں جن میں سے اکثر انگریزی، فارسی اور عربی سے اُردو میں ترجمہ ہوئے ہیں اور ساتھ ساتھ دیوناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اِن مسودات کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل اُلدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ عالم اور فاضل حضرات مہاراجہ کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے اور اُنھوں نے طب، انجینئرنگ، منطق، تاریخ، مذہب، کاغذ سازی، اناٹامی جیسے موضوعات سے متعلق مسودات تیار کیے۔ قیاس سے کہ اِن ادبا و فضلا نے سرسید تحریک سے وابستہ قلم کاروں کی تصنیفات اور ترجموں سے اثرات قبول کر کے اُردو میں تصنیف و تالیفِ اور ترجمہ کی طرف توجہ دی۔ اِن کی زبان صاف سُتھری ہے۔ کہیں کہیں ادبی چاشنی بھی ملتی ہے۔ جہاں کہیں انگریزی اصطلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں ان کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ابھی اُردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا منصب عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن زبان عام پڑھے لکھے لوگوں میں مقبُول ہو رہی تھی۔ چنانچہ دارالترجمہ کے دائرۂ عمل سے بھی کئی نثری کارنامے وجود میں آئے۔ چودھری مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۴ء۔۱۸۶۵ء کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اُس نے اُردو میں اپنا سفرنامہ قلم بند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اُردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر مُشتمل یہ سفرنامہ بڑا دِل چسپ ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کارناموں میں ''بدیا بلاس'' پریس کا قیام بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ یہ پریس ۱۸۸۲ء میں قائم ہوا۔ اِسی سال ریاست کا پہلا اخبار ''بدیا بلاس'' سرکاری گزٹ کے طور پر جاری ہوا۔ یہ اخبار دیوناگری اور اُردو دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا۔

اِس عہد کے اہم ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کا نام سرِفہرست ہے۔ انہوں نے 1877ء میں گلدستہ کشمیر کے نام سے کشمیر کی جغرافیائی تاریخ تصنیف کی تھی۔ گلدستہ کشمیر ریاست کی اولیں نثری تصنیفات میں شمار کی

جاتی ہے۔ خستہؔ، شبلیؔ اور حالیؔ کے ہم عصر تھے۔ وہ کشمیری الاصل تھے اور سال ہا سال ریاست سے باہر لاہور اور پٹیالہ میں رہ چکے تھے۔ قیامِ لاہور کے دوران وہ ''راوی ریفارمر''، ''خیر خواہِ کشمیر''، ''دیش کی پُکار'' اور اِس قبیل کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ لاہور میں اِن کا تعارف پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ ہو چُکا تھا۔ وہ جدت پسند انجمنِ پنجاب کی کارکردگیوں سے بھی واقف تھے۔ اِس لیے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عہد کے نئے خیالات اور تصورات سے واقف تھے بلکہ اُردوٗ زبان کے مزاج سے بھی آگاہ تھے۔ خستہؔ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نِگار تھے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں کشمیر آئے اور آتے ہی اپنی خُداداد قابلیت کے باعث مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

خستہؔ کے کئی نثر کارنامے ہیں۔ اُن کی تصنیف ''گُلدستہ کشمیر'' اُردوٗ نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ جو عہدِ قدیم سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد تک کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ بعد میں یہ کتاب سرینگر کے عثمان بکڈپو نے بھی شائع کی لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔ خستہؔ رنبیر سنگھ کے عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لیے تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی اہمیت ہے۔ یہ کتاب شُستہ نثر میں ہے اور اِس ثقالت سے پاک ہے جو اِس سے قبل کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ خستہؔ کی دُوسری تصنیف رسالہ ''گُلزارِ فواید'' ہے۔ یہ دراصل ایک قِصّہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے ''مراۃ العروس'' کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلُوب سلیس اور واضح ہے۔ کہیں کہیں مقفّٰی اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔ خستہؔ کے نثری کارناموں میں اُن کے انشائیے بھی شامل ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے اِنتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ اِس عہد تک اُردوٗ پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا اور اُردو زبان ذریعۂ اِظہار بن گئی تھی۔ مہاراجہ نے اِس زبان کی مقبُولیت کے پیشِ نظر ۱۸۸۹ء میں اِسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا۔

ہر گوپال خستہؔ کے چھوٹے بھائی سالگ رام سالکؔ اِس عہد کے دُوسرے اہم نثر نِگار ہیں۔ سالکؔ کا ادبی ذوق بھی خستہؔ کی طرح لاہور کی ادب پرور فضاؤں میں پروان چڑھا تھا۔ وہ عرصۂ دراز تک اودھ اخبار لکھنؤ میں مضامین

لکھتے رہے۔اُنھوں نے خود بھی لاہور سے اپنے بھائی کے ساتھ ''خیر خواہِ کشمیر'' نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ اِس عہد میں عیسائی مشینریوں اور مبلغوں کی آمد کا سِلسِلہ شروع ہوا۔مغربی خیالات کی توسیع سے اور عیسائیت کی تبلیغ روکنے کے لیے مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اِس دوران سالکؔ کشمیر آ چکے تھے۔ یہاں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی میں سناتن دھرم سبھا تشکیل ہوئی تھی جس کے زیرِ اہتمام عیسائیوں کے خلاف کئی کتابچے تیار کیے گئے۔ سالکؔ نے بھی مُورتی، مُنڈن، دھرم اُپدیش اور شاستر ارتھ جیسی کتابیں مُرتب کیں۔ اِس کے علاوہ لغاتِ اُردوٗ اور محاوراتِ اُردو کے نام سے بھی چھوٹی کتابیں مُرتب کیں۔

سالکؔ کی اُردوٗ خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔اُنھوں نے رنبیر ڈنڈ بدھی (قانون تعزیرات جموں وکشمیر) کی مبسوط شرح تحریر کی۔ اِس کے علاوہ مجموعہ ضابطۂ دیوانی، قانون رجسٹری اور دُوسری قانونی دستاویزات کی شرح بھی لکھی ہے۔خالص ادبی کارناموں میں ایک اچھی تصنیف گنجینہ فطرت یا مناظرِ فطرت کے نام سے شائع ہوئی ہے۔''داستان جگت رُوپ'' سالکؔ کا ایک ادبی کارنامہ ہے جو شائع نہ ہوسکا۔''تحفۂ سالک'' ایک سفرنامہ ہے جس میں قصّے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔عبدالقادر سروری نے خستہؔ اور سالکؔ کے بارے میں دو بھائی کے نام سے ایک طویل مضمون لکھا ہے۔

اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور اور دُوسری جگہوں سے ریاست کا رابطہ اخبارات کے ذریعے قائم ہوا۔ اِن اخبارات میں ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین شائع ہونے لگے۔جس سے یہاں کے لوگوں میں صحافت سے دِل چسپی پیدا ہوگئی اور لکھنے والوں کی صلاحیت کو اُبھرنے کا موقعہ دستیاب ہوا۔محمد اُلدین فوقؔ کے مساعی اِس ضمن میں نمایاں ہے۔فوقؔ نے لاہور اور کشمیر سے مختلف اخبارات جاری کیے اور اپنے قلم کی توانائیوں کے ساتھ اہلِ کشمیر کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔فوقؔ اپنے عہد کے سب سے بڑے ادیب تھے۔اُنھوں نے ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ کے شعبوں میں متعدد کارنامے انجام دیے۔

۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اُردو اخبار جموں سے جاری کیا۔ اِس اخبار کی اشاعت

نے اُردو نثر کی توسیع اور ترقی کے لیے راہیں کھول دیں اور نئی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ اِس طرح سے نئے نثر نِگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ اِن میں مولوی زین العابدین، سالگرام کول، لال کلم، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، کشپ بندھو، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، عشرتؔ کشتواڑی، نشاطؔ کشتواڑی، دیا کرشن گردشؔ، غلام حیدر چشتی، قیسؔ شیروانی، تاراچند ترسیل، سالک خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سری نگر کا پہلا اخبار ''وتستا'' پریم ناتھ بزاز کی اِدارت میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ اِس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۵ء میں ''ہمدرد'' شائع کیا۔ ''ہمدرد'' ریاست کا پہلا مصور ہفت روزہ تھا۔ اِسی سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے ''مارتنڈ'' کا اجرا بھی ہوا۔ اِن اخبارات نے صحافت کا ایک نیا معیار قایم کیا۔ اِن اخباروں کے ذریعے نثر کی آبیاری ہوئی۔ اِس دور کے اہم نثر نِگار پردیسی، دینا ناتھ، داریکو شاہد، نیاز کامراجی، انور پریمیؔ، وشوا ناتھ درماہ، آنند کول بامزی، شیام لال ایمہ، تیرتھ کاشمیری وغیرہ تھے۔ اِس دور کی اہم نثری تصانیف پریم ناتھ بزاز کی ''کشمیر کا گاندھی''، تیرتھ کاشمیری کی ''دیوتا''، وشوا ناتھ درماہ کی ''تلاشِ حقیقت'' اور ''انکشافِ حقیقت'' اور سروانند چراغی اور آفتاب کول وانچو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔

''رنبیر''، ''وتستا'' اور ''مارتنڈ'' کے بعد آج تک اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء تک اخبارات کی تعداد ۴۷ تک پہنچ گئی تھی۔ آزادی کے بعد اِس تعداد میں اِضافہ ہوا ہے۔ اِن اخبارات میں روزنامے بھی ہیں، ہفت روزہ بھی اور پندرہ روزہ بھی۔ دیش، چاند، کیسری، خدمت، حقیقت، نور، جیوتی، آفتاب، سرینگر ٹائمز، نوائے صُبح، اقبال، ہمارا استاد، کشمیر، سویرا، امر، پاسبان، سدرشن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رسائل میں پریم، فردوس، کونگ پوش، تعلیمِ جدید، آزاد، گلریز، تعمیر، جیوتی، وکیل، ہما، جھرنا، کینواس، دیش، ادبیات، شیرازہ، ہمارا ادب، بازیافت، اقبالیات قابلِ ذکر ہیں۔ مختلف وقتوں پر چھپنے والے اِن رسایل نے کشمیر کے تخلیقی ذہن کی بازیافت کی اور اُردو نثر کے امکانات روشن کیے۔ آج کی تاریخ میں جموں کشمیر اور لڈاخ سے شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ڈھائی سو سے

تجاوز کر چکی ہے لیکن اِن میں سے اکثر محض تجارتی خانہ پُری کے لئے ہی شائع ہوتے ہیں

اُردو نثر کی توسیع کے ساتھ ساتھ فکشن کے مختلف شعبے بھی معرضِ وجود میں آ گئے۔ چنانچہ افسانے، ناول، ڈرامے، ادبِ لطیف، انشائیے، تحقیق وتنقید غرض کہ ہر شعبے میں ریاست کے قلم کاروں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں اور نہ صرف ریاست میں بلکہ پُوری اُردو دُنیا میں اپنی دھاک جما دی۔ آج ہمارے کتنے ہی قلم کار ہیں جن کی اُردو دُنیا میں اپنی پہچان ہے اور جن کی آواز پایۂ اعتبار رکھتی ہے۔ فکشن کے شعبے میں پریم ناتھ پردیسی پریم ناتھ در، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، غلام حیدر چشتی، نند لال بے غرض، دینا ناتھ داریکو، شیام لال ایمہ، گنگا دھر دیہاتی، محمود ہاشمی، تیرتھ کاشمیری، سوم نات زتشی، بنسی نردوش، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، برج پریمی، ہری کرشن کول، کشوری منچندہ، جیوتیشور پتھک، لیش سروج، نور شاہ، امر مالموہی، ڈی کے کنول، مالک رام آنند، محمد زماں آزردہ، رام کمار ابرول، شبنم قیوم، عمر مجید اور دُوسرے بیسوں تابناک ستارے ہیں جن کی تخلیقات ہر زمانے میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔ ہمارے محققین اور ناقدین نے ادھر تنقید اور تحقیق کے میدان میں اچھا کام کیا ہے۔ ادبی تنقید وتحقیق کے ابتدائی نمونوں میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کی معرکتہ الآرا تصنیف ناٹک ساگر تسلیم کی جاسکتی ہے جو پہلی بار ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اِس کتاب کو ڈرامانِگاری کے فن پر پہلی اُردو تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے بعد اِن ہی مصنفین نے امانت کی ''اندر سبھا'' مُرتب کر کے شائع کی۔ اِس میں مقدمہ اور حواشی شامل کر کے اِس کی افادیت میں اِضافہ کیا۔

عبدالاحد آزاد نے ۱۹۳۵ء میں حیاتِ مہجور کے نام سے ایک چھوٹا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے ذوقِ جُستجُو نے اِسے ایک مبسوط کارنامہ بنایا جواب ''کشمیری زبان اور شاعری'' کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اِس قابلِ قدر اور معتبر تذکرے میں لل دید سے لے کر مہجور کے عہد تک بیشتر شعراء کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اِن میں معروف اور غیر معروف دونوں قسم کے شعرا شامل ہیں۔ لیکن اِس کی اہمیت اِس لیے بڑھ جاتی ہے کہ آزاد نے تحقیق

کے ساتھ تنقید کا حق بھی ادا کیا ہے۔

دُوسرے ناقدوں اور محققوں میں نند لال طالب، ڈاکٹر عزیز احمد قریشی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر اکبر حیدری، پروفیسر پشپ، رحمان راہی، برج پریمی، موتی لال ساقی، کاشی ناتھ پنڈتا، امین کامل، بلدیو پرشاد شرما، مشعل سلطان پوری، نشاط انصاری، رشید نازکی، ظہور الدین، عابد پیشاوری، قیصر قلندر اور بیسوں دُوسرے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے ادب، تہذیب اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین اور مستقل کتابیں تصنیف کیں جو نہ صرف اُن کی وسعت نظری پر دال ہیں بلکہ جن میں اسالیب کی رنگارنگی بھی نظر آتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو نظر سالک رام سالک اور محمد الدین فوق کے اُن قصّوں پر جا کر ٹھہرتی ہے جن میں داستانوں کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اِن میں سالک رام سالک کا ''داستانِ جگت روپ'' اور ''تحفۂ سالک'' اور محمد دین فوق کا نیم تاریخی قصّہ ''انارکلی'' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تصنیفات اگرچہ پورے طور پر ناول کے زمرے میں نہیں رکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن چوں کہ اِن میں قصّہ پن کی فضا موجود ہے اور یہ زیادہ طویل بھی نہیں ہیں اِس لیے یہ ناول سے بھی قریب ہیں۔ ''داستانِ جگت روپ'' داستان سے زیادہ قریب ہے۔ مافوق الفطرت عناصر اور پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک اِس قصّے میں پائی جاتی ہے لیکن چوں کہ ہمارے ہاں اِس سے پہلے نثر میں کوئی ایسا کارنامہ نظر نہیں آتا ہے اِس لیے اِس کی اِبتدائی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ''تحفۂ سالک'' میں مصنف نے قصّے کے پیرائے میں مختلف ممالک کے سمندری سفر کا ذکر کیا ہے۔

محمد الدین فوق کے یہاں ناول کا فنی شعور سالک سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے۔ فوق نے ایک سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ اِن میں وہ کتابیں بھی آتی ہیں جنھیں ہم غیر افسانوی ادب کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ نثری

کارناموں میں اُنھوں نے تاریخی اور نیم تاریخی قصّے تصنیف کیے۔ اِن کے بعض قصّوں میں ناول کی جھلک دِکھائی دیتی ہے جس کا اعتراف اُنھوں نے خود بھی کیا ہے۔ ''اکبر اور انارکلی'' اِن کے دو مشہور تاریخی قصّے ہیں۔ اِن کو ہم بیسویں صدی کے اولین ناولوں میں بھی شُمار کر سکتے ہیں۔ فوقؔ کا قصّہ ''انارکلی'' 1900ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اِس کو ہم تاریخی ناول کے زمرے میں اِس لیے رکھتے ہیں کیوں کہ اِس کا پلاٹ حقیقت پر مبنی ہے۔ فوقؔ کے دُوسرے ناولوں میں ناکام، غریب الدیار اور نیم حکیم قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کا ناول ''اکبر'' تاریخی ناول میں بعض خصوصیات کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ناول بھی لاہور سے 1909 میں شائع ہوا۔ قاضی عبدالستار کا ناول ''داراشکوہ'' کا اندز بیان فوق کے انداز بیان سے مشابہت رکھتا ہے۔

اِن دو اِبتدائی ناول نگاروں کے بعد ریاست میں وشوانا تھ درؔماں، موہن مارواہ اور شمبھو ناتھ ناظرؔ اور پنڈت نند لال بےغرضؔ نے اِس روایت کو آگے بڑھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست میں اخبارات نکلنے کا سِلسِلہ شروع ہو گیا تھا۔ اِن ناول نِگاروں نے ناول کی صنف کی طرف توجہ دے کر اُنھیں ریاست کے مختلف اخبارات میں بھی چھپوایا۔ نند لال بےغرضؔ کا ناول ''تازیانۂ عبرت'' اِس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ یہ سرشارؔ کے ''فسانۂ آزاد'' کی طرز پر لکھا گیا اور اِس میں داستانی فضا اُسی طرح سے ہے جس طرح سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' میں۔

1947ء سے قبل پریم ناتھ پردیسیؔ نے ''پوتی'' کے عنوان سے ناول لکھا جو چھپا بھی لیکن مُلک کی تقسیم کا واقعہ جب رونما ہوا تو یہ ناول تلف ہو گیا۔ اِسی دور میں رامانند ساگرؔ نے ایک ایسا ناول تحریر کیا جس کی ادبی دُنیا میں دھوم مچ گئی اور یہ ناول تھا ''اور اِنسان مر گیا۔'' اِس ناول میں اُنھوں نے فسادات کی ہولناکیاں بیان کی ہیں۔ اُنھوں نے اِبتدا میں اِس ناول کو ''فساد اور امن'' کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اِس ناول کی بنیاد وہ نوٹس بنے کہ جب بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو کر، اِنسانیت کو بھول کر، قتل و غارت گری کے بازار کو گرم کر رہا تھا۔ رامانند ساگر نے اِن حالات کو دیکھ کر مختلف نوٹس لکھے جو بعد میں اِس ناول کی تخلیق کا موجب بنے۔

1947ء کے بعد ریاست کے بعض ناول نگاروں نے چند ایک عمدہ ناول تحریر کئے اور فنی اعتبار سے ناول کو مستحکم کیا ہے۔ یہ ناول اِس لیے بھی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ یہ کشمیر کے مختلف سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی جھلکیوں کو پیش کرنے کے علاوہ یہاں کے خوبصورت مناظر کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اب ناول نرسنگھ داس نرگس کے معاصرین کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکور پونچھی کے ہاتھوں پروان چڑھتا ہے۔ نرگس نے پاربتی، جانکی، اور نرملا کے نام سے تین ناول لکھے۔ کشمیری لال ذاکر نے ''سیندور کی راکھ'' لکھ کر اپنے آپ کو بحیثیت ناول نِگار متعارف کرایا۔ اِن کے دُوسرے ناولوں میں ''سمندر صلیب اور وہ، انگوٹھے کا نشان، دھرتی، سدا سہاگن، کرماں والی لمحوں میں بکھری زندگی جاتی ہوئی رُت، خون پھر خون ہے، دوبتے سورج کی کتھا، چھٹی کا دودھ، چار میل لمبی سڑک'' اور ''میں اُسے پہچانتی ہوں'' وغیرہ شامل ہیں۔

کشمیری لال ذاکر اِنسانی قدروں کی حمایت اور مذہب اور فرقی کی غیر انسانی تقسیم کی خدمت کرتے ہیں اِن کے ناولوں میں سنجیدہ فکر، اور دانشوری کی لہریں ملتی ہیں جموں وکشمیر کی مشترکہ تہذیب کی ترجمانی کو انہوں نے اپنے اکثر افسانوں اور ناولوں میں ایک مقدس فریضے کی طرح برتا ہے۔ مالک رام آنند نے ''نئے خدا''، ''دہکتے پھول''، ''شبنم آنکھیں''، ''صلیب اور دیوتا'' اور ''اپنے وطن میں اجنبی'' لکھے۔

ریاست میں اُردو ناول کے سِلسلے میں ٹھاکور پونچھی کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اُنھیں ناول کے فن اور زبان و بیان پر دسترس بھی حاصل تھی۔ اِنسانی نفسیات کو اُنھوں نے اپنے ناولوں میں پیش کر کے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ دیہاتی اور شہری زِندگی دونوں کی تصویر کشی اُنھوں نے اپنے ناولوں میں پیش کی ہے۔ سماجی مسائل کو بھی اُنھوں نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اُن کے مشہور ناول ''وادیاں اور ویرانے''، ''یادوں کے کھنڈر''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''، ''زلف کے سر ہونے تک''، ''اُداس تنہائیاں''، ''چاندنی کے سائے'' اور ''پیاسے بادل'' ڈیڈی، رات کے گھونگھٹ اور ''سورج سمندر میں ڈوبتا ہے۔ (نامکمل) وغیرہ شامل ہیں۔

1960ء کے بعد اُردو ناول کی روایت کو جن ناول نِگاروں نے آگے بڑھایا اُن میں تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، نور شاہ، شبنم قیوم، عمر مجید، بھوشن لال بھوشن، فاروق زنیزو، رشید پروین اور جان محمد آزاد کے نام نمایاں ہیں۔

تیج بہادر بھان نے صرف ایک ناول ''سیلاب اور قطرے'' لکھا جس میں اُنھوں نے کشمیر کی معاشرتی زندگی، افلاس، کشمیریوں کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ عبدالقادر سروری نے کشمیر میں اُردو میں اِس ناول پر سرسری تبصرہ کیا ہے۔ حامدی کاشمیری کے ''پرچھائیوں کا شہر''، ''بہاروں میں شعلے''، ''بلندیوں کے خواب''، ''پگھلتے خواب'' اور ''اجنبی راستے'' خاصے مشہور ہوئے۔ اِن ناولوں میں جہاں رومانیت ہے وہیں کشمیر کی زندگی کے ساتھ ساتھ یہاں کا سیاسی اور سماجی ماحول بھی ہے۔

علی محمد لون اور غلام رسول سنتوش نے ''ادب کو شاید ہے تیری آرزو'' اور ''سمندر پیاسا ہے'' جیسے ناول دیے۔ لون کا ایک ناول ''ایک دریا'' کشمیر کے سماجی اور تہذیبی بحران نے موضوع پر ہے۔ سنتوش کا ناول علامتی نوعیت کا ہے اور تخلیقی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔

نور شاہ بنیادی طور پر کہ افسانہ نِگار ہیں لیکن اُن کے دو ناول ''پائل کے زخم'' اور ''نیلی جھیل کالے سائے'' کافی مشہور ہوئے۔ اِن دونوں ناولوں میں اُنھوں نے کشمیر کی مفلوک الحال اور مجبور لوگوں کی زندگی، اُن کے خواب، ارمان اور رنج و غم کو پیش کیا ہے۔

نئی نسل کے ناول نِگاروں میں عمر مجید، شبنم قیوم، جان محمد آزاد کے علاوہ بھوشن لال بھوشن کا ناول ''صرف پانچ ہزار''، رشید پروین کے دو ناول ''دل اور دیا'' اور ''پیاسی پایل اور وحشی''، سعید ساحل کے ناول ''خون اور محبت''، ''منزل اور تلاش'' اور ''قحط'' منظرِ عام پر آئے۔ عمر مجید کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ''درد کا دیا'' میں کشمیر کی سماجی زندگی کی پُر تاثیر تصور کشی کی گئی ہے۔

شبنم قیوم نے اپنی تحریروں کے ذریعے جہاں سیاسی حکمرانوں کے چہروں پر پڑے پردوں کو چاک کیا ہے وہیں زندگی کے درد وغم اور استحصال کو بھی پیش کیا ہے۔ ''موت اور زندگی''، ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا''، ''چراغ کا اندھیرا''، ''اِنسان اور کتے''، ''جس دیش میں جہلم بہتی ہے'' شبنم قیوم کے ناول ہیں۔

''زخموں کی سالگرہ'' اور ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' فاروق رینزو کے قابلِ ذکر ناول ہیں۔ ''زخموں کی سالگرہ'' میں اُنھوں نے نئی نسل کی نا آسودگیوں، محرومیوں اور نفسیاتی اُلجھنوں کو پیش کیا ہے۔ جب کہ ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' اُن کا سماجی اور اصلاحی ناول ہے۔

جان محمد آزاد نے تین ناول لکھے ہیں۔ ''کشمیر جاگ اُٹھا''، ''وادیاں بُلا رہی ہیں'' اور ''برفیلے لمحوں کا جنگل''۔ وہ ناول کے فن سے واقف ہیں اور اپنے گردوپیش کی زندگی سے ناول کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے اسلُوب کا اثر ان کی تحریروں پر نمایاں ہے۔ ''وادیاں بُلا رہی ہیں'' ایک جذباتی ناول ہے جس میں ناول نِگار نے کشمیر کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ''کشمیر جاگ اُٹھا'' کا کینوس پہلے سے زیادہ وسیع ہے جس میں بدلتی ہوئی قدروں اور سیاسی منظر نامے کے ساتھ ہی ساتھ کشمیر کی سسکتی اور تڑپتی زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔

مختصراً ریاست جموں وکشمیر میں اگرچہ ناول کے اِبتدائی نقوش سالکؔ اور فوقؔ کے قصّوں میں ملتے ہیں لیکن یہاں 1947ء کے بعد ہی ناول توجہ کا مرکز بنا۔ ناول کی صورت میں ہمارے پاس جو سرمایہ موجود ہے وہ 1947ء کے بعد کا ہی ہے۔ اگرچہ یہ کم ہے مگر معیار کے اعتبار سے اِس سرمایے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ ناول، ناول کے فنی اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھے گئے۔ اِس لیے اِن میں ہمیں فنی لوازمات بھی مل جاتے ہیں۔ ریاست میں لکھے گئے یہ ناول اپنی اِنفرادیت کی وجہ سے اپنا الگ ہی مقام رکھتے ہیں۔ کشمیر کے پس منظر میں غیر ریاستی ناول نگاروں نے جو ناول لکھے اِن میں سب سے اہم عزیز احمد کا ناول ''آگ'' ہے۔ اِس ناول میں عزیز احمد نے 1908 سے 1945 تک کے عرصے میں ریاست کو درپیش مسائل اور تبدیلیوں کی عکاسی ہمدردانہ انداز میں کی ہے۔ اِس کا لہجہ احتجاجی ہے اور

ریاست جموں وکشمیر کی تحریک آزادی کے سائے بھی اِس ناول میں نمایاں ہیں۔

حالیہ برسوں میں ویریندر پٹواری، آنند لہر، شبنم قیوم وغیرہ کے کئی ناول شائع ہوئے ہیں لیکن اِن ناولوں کا فنی و جمالیاتی معیار، سابقہ ناول نگاروں کے ناولوں سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔

جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ

ریاست جموں وکشمیر میں اُردوٗ نے ڈوگرہ حکمرانوں کے وقت میں رواج پایا۔ جموں کے ڈوگرہ خاندان کا اپنے دورِ حکومت میں دلی، لاہور اور پنجاب سے گہرا رابطہ تھا۔ اُدھر کشمیری تاجروں کا بھی ریاست سے ان علاقوں میں آنا جانا تھا جہاں اُردو پھول، پھل اور پھیل رہی تھی۔ اِس طرح سے جموں اور کشمیر میں اِبتدا میں اُردوٗ کا کسی حد تک چلن قائم ہوا۔ بقول ہرگوپال کول خستہ[1] کشمیر میں اُردوٗ کا چلن ۱۸۷۷ء میں صرف بازاروں تک محدود تھا۔ جموں وکشمیر میں اُردوٗ زبان کو رائج کرنے اور اسے فروغ دینے میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا سب سے زیادہ اور اہم ہاتھ رہا ہے۔ ۱۸۹۳ء[2] میں جب مہاراجہ کو انگریزوں کی سازش کے تحت گدی سے ہٹا کر مُلک بدر کر دیا گیا تو حکومت کا کام ایک انگریز ریذیڈنٹ کو سونپا گیا جس کی مدد کے لیے ایک کونسل بنائی گئی جس کی ساری کاروائی فارسی کے بدلے انگریزی میں کرنے کا حکم صادر ہوا مگر جب مہاراجہ نے دوبارہ گدی حاصل کی تو اُس نے انگریزی زبان کو ہٹا کر اُردوٗ کو راج دربار کی زبان قرار دیا۔ گو یہ کاروائی انگریزوں کی زبان سے انتقام کے جذبے کے تحت عمل میں لائی گئی مگر تب سے ہی اُردوٗ جموں وکشمیر کی سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ اِسے صرف آئینی حقوق حاصل ہیں ورنہ طوطی تو انگریزی ہی کا بول رہا ہے۔

جموں وکشمیر میں جب اُردوٗ کی حیثیت ایک نومولود بچّے کی سی تھی تو اُس دور میں کشمیری شاعروں میں روؔپہ بھوانی، محمود گامؔی، بلبلؔ ناگامی، پرمانند واسا کول وگرہ بلبل، کرشن راز دان اور رسولؔ میر کے ہاں اِس کے اِبتدائی نقوش ملتے ہیں۔ اِن کے ساتھ ہی ہرگوپال خستؔہ، سالک رام سالکؔ، منشی سراج الدین، سعدالدین سعدؔ[1]، چودھری خوشی محمد

ناظر، قمر کمرازی، محمد عمر نور آلہی، عماد الدین سوز اور غلام حیدر چشتی وغیرہ ادیبوں کے نام لیے جا سکتے ہیں، جنھوں نے یہاں اِس پودے کی بھرپور آبیاری کی۔ بلاشبہ اِن میں سے بہت سے غیر کشمیری تھے مگر ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی ترقی وترویج میں اُن کے حصّے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جموں وکشمیر میں یوں تو اُردو افسانے کی باضابطہ ابتداء پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوتی ہے مگر یہاں کی افسانہ نِگاری کی تاریخ ادھوری سمجھی جائے گی جب تک کرشن چندر کا ذکر نہ کیا جائے۔ جن کا رومان انگیز بچپن پونچھ کی رومان پرور فضا میں گذرا۔ جموں وکشمیر کے ساتھ اُن کا روحانی اور تخلیقی رشتہ بڑا گہرا ہے۔ پروفیسر ''بلاقی رام'' سے لے کر ''بے پنکھ فرشتہ'' یا ''ادب برائے بطخ'' تک اُن کے بے شمار ناول اور افسانے اِسی ریاست اور اِس کے ماحول سے متعلق ہیں۔ اِن کے کردار یہاں کے عوام کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ کرشن چندر بنیادی طور پر رومان پرست اور جذباتی فن کار تھے لیکن ان کے فن میں رومان کے ساتھ ساتھ گہرا اور کاری سماجی طنز بھی ہوتا ہے جو زندگی کے حقایق کو چھوتا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں حقیقت و رومان کا گہرا اِمتزاج ملتا ہے۔ یہ بزرگ کشمیر کے مشہور اہلِ قلم مرزا کمال الدین شیدا کے اجداد میں سے تھے جن کے ہاں اپنے دورۂ کشمیر کے دوران علامہ شبلی نعمانی نے قیام کیا تھا۔

پریم ناتھ پردیسی کی ادبی زندگی کا سفر اُس وقت شروع ہوتا ہے جب ریاستی عوام مطلق العنانی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں درد وکرب، حاکمانہ جور و جبر، حرمان و یاس، غربت و افلاس، غلامی، جہالت، سماجی نابرابری، طبقاتی کشمکش، بیکاری اور پریشانی جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

پریم ناتھ پردیسی ابتداء میں ادب برائے ادب کے نقیب تھے۔ مگر جب پریم چند کی کہانی ''کفن'' اور ''ترقی پسند مصنفین کا مشترکہ مجموعہ ''انگارے'' چھپا اور اِس کے ساتھ ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ قیام بھی عمل میں آیا تو پردیسی کو یہ احساس شدت کے ساتھ ہوا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔

اِس لیے اُنھوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت اور تصور پرستی کے خیالات کو ترک کر کے ادب کے خارجی مقصدی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ اُنھوں نے اپنے ایک خط میں صدیقہ بیگم سیوہاروی کو لکھا..... ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر فخر نہیں کر سکتا.....اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ ایک افسانہ نِگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطنِ عزیز کے کیا فرائض ہیں۔[۱]

پریم ناتھ پردیسی کے اِس خط سے ہمیں دو باتوں کا اشارہ مِلتا ہے۔ ایک یہ کہ اُن کا ادب کے بارے میں کیا نظریہ تھا۔ دُوسرے جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ نِگاری کی اِبتدا حقیقتاً ۱۹۳۱۔۱۹۳۲ء کے آس پاس ہوئی ہے۔ پردیسی کا شمار جموں و کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اس وقت مُلک کے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا۔ ان کے بعد کے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اور مدھرتاؤں کا سنگیت ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ نرک، شام و سحر، ہماری دُنیا، کیچڑ کے دیوتا اور بہتے چراغ اِسی قبیل کے افسانے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے ہم عصر افسانہ نِگاروں میں قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، مولا رامکوٹی (نرسنگھ داس نرگس) ٹھاکر پونچھی، کوثر سیمابی، موہن یاور، اخگر عسکری، دیا کرشن گردش، کیف اسرائیلی، گنگا دھر بھٹ دیہاتی، سومناتھ زتشی اور مہندر ناتھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ در، مہندر ناتھ اور کشمیری لال ذاکر کے افسانے فن اور تجربے کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک دُوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ لیکن اِن سب کی اپنی اپنی منفرد پہچان بھی ہے اُنھوں نے اس وقت کے اپنے فن پاروں میں زیادہ تر جموں و کشمیر کے ماحول کی عکاسی کی ہے اِسی لیے اِن سب نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم، سیاسی و سماجی بے راہ روی، معاشی و اقتصادی بدحالی، سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام، اس دور کی جہالت، پراگندگی، بھوک، بیماری، افلاس، ظلم و ستم اور ظالم و مظلوم کی کشمکش جیسے موضوعات کا سہارا لے کر اپنے دور کے کرب کو فنی و جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اِس دور کے سبھی افسانہ نِگاروں نے اپنے افسانوں میں فن کی نئی قدروں اور نئے رُجحانات کو سموتے وقت انتہائی خلوص اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ پردیسی کا ''بہتے چراغ''، ''شام وسحر'' اور قدرت اللہ شہاب کا ''سردار جسونت سنگھ'' افسانوں کے کردار نئی روشنی، نئی قدروں اور نئے رُجحانات کے علمبردار ہیں۔ ٹھاکر پونچھی نے ''خانہ بدوش''، ''یہ پتھر میرے ہیں''، ''بے خواب کواڑ'' اور موہن یاور نے ''اُڑتے آنچل''، ''سیاہ تاج محل''، ''تیسری آنکھ'' جیسے افسانے لکھ کر جنسی اور نفسیاتی کشمکش کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ راما نند ساگر نے ''ٹنگمرگ کے اڈے پر''، ''آئینے''، ''آبِ حیات'' اور پریم ناتھ در نے ''آخ تھو''، ''نیلی آنکھیں''، ''کاغذ کا واسودیو'' افسانوں میں جہاں تشبیہات، استعارات، اشاریت اور ابہام سے کام لے کر جہاں ریاست کے اُردو افسانہ کو اسلوب کے اعتبار سے ایک نیا موڑ دیا ہے وہیں سماجی بُرائیوں پر طنز کرتے ہوئے اصلاح اور تعمیر کی راہیں بھی ہموار کی ہیں۔ ان کے افسانوں میں وارداتِ قلب اور نفسیات کا خلاقانہ تحلیلی تجزیہ بھی ہے۔ طنز ومزاح کے علاوہ استعارات اور تشبیہات کی مدد سے جس شگفتہ بیانی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ مولا رام کوٹی (نرسنگھ دیو نرگس) کے ''غریب کی عید''، ''ہری جن لڑکی''، ''قانون کے محافظ'' افسانوں میں شخصی حکومت، جاگیردارانہ نظام، اقتصادی بدحالی، سماجی وطبقاتی کشمکش اور دیہاتی ماحول کی عکاسی بدرجہ اتم موجود ہے، حسن وعشق کا موضوع اگرچہ پٹا ہوا ہے مگر حکام کی بے دردی اور سرمایہ داروں کی بالا دستی کے باوجود ان کے افسانوں میں دیہاتی دوشیزاؤں کی آہیں، اُن کا بے لوث پیار، نقرئی قہقہے اور شرمیلی مسکراہٹیں بھی ملتی ہیں۔

مہندر ناتھ، سومناتھ زتشی اور کشمیری لال ذاکر نے اپنے افسانوں میں خارجی اِنسانی زندگی، کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ذہنی پراگندگی اور جنسی ونفسیاتی اُلجھنوں سے متعلق انتہائی حسین مرقعے پیش کیے ہیں۔ جموں وکشمیر میں افسانہ نِگاری کے اِس دور میں اور بھی کئی فن کار سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے کنول پروانہ، محمود ہاشمی، جگدیش کنول، کندن لال، گنگا دھر بٹ دیہاتی، وجے سُمن سوسن اور دیا نند کپور نے بھی افسانوی ادب میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اِن کے ساتھ محبوبہ یاسمین نے ''دِل ہی تو ہے''، شیخ منظور الٰہی نے ''ایک سال''، گلزار احمد فدا نے ''ابا کے پاس''، عزیز کاش نے

''رجنی''، محمد نور الٰہی نے ''گلوری''، شیخ عبدالعزیز علائی نے ''سرائے''، طالب گورگانی نے ''ہاتھی نالہ'' اور عبدالمجید نظامی نے ''تحفہ'' جیسے مختلف عنوانات کے تحت افسانے لِکھ کر روزمرہ زندگی کے مسائل، عوام کے جذبات اور اِس وقت کے اہم تقاضوں کو اپنے فن میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اُردو افسانے میں ایک نئے باب کا اضافہ اُس وقت ہوا جب ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صُبح طلوع ہوئی۔ جموں و کشمیر کو بھی شخصی حکومت سے نجات ملی۔ لیکن مُلک کی تقسیم سے ادیبوں کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ احباب و اقارب بچھڑ گئے۔ کئی ایک فرقہ وارانہ فسادات میں مارے گئے۔ کشمیر پر قبائیلیوں کا حملہ ہوا۔ سارا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کئی خونچکان داستانیں وجود میں آئیں۔ اِن حالات سے ادیب وفن کار یہاں تک متاثر ہوئے کہ پریم ناتھ پردیسی نیشنل ملیشیا National Malatia میں بھرتی ہوگئے اور انھوں نے اِن ہی دِنوں عصری حالات پر مبنی ''نغمہ جنگ'' اور ''بہتے چراغ'' جیسے افسانے لکھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''اب آپ کے چراغ نہیں جلیں گے سیٹھ جی، دُنیا کو امن کی ضرورت ہے۔''[۱] یہ جملہ امن کے لیے ان کے دِل میں موجود تڑپ کا اظہار ہے۔

۱۹۴۷ء میں مُلک کی تقسیم کے ساتھ ہی ساتھ ہماری ریاست بھی بٹ گئی۔ بہت سے افسانہ نِگار پاکستان چلے گئے اور کچھ مُلک کے دیگر حصّوں میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے اور کئی افسانہ نِگاروں کے تخلیقی سوتے خشک ہو گئے۔ قدرت اللہ شہاب، محمد عمر نور الٰہی، کوثر سیمابی، محبوبہ یاسمین، طالب گورگانی، کیف اسرائیلی، گلزار احمد فدا، عبدالمجید نظامی، اخگر عسکری، شیخ منظور الٰہی، عبدالعزیز علائی اور عزیز پرکاش ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے ریاست ادیبوں اور افسانہ نِگاروں کی ایک بہت بڑی جماعت سے محروم ہوگئی۔ راما نند ساگر، کشمیری لال ذاکر، دیا کرشن گردش، جگدیش کنول، کنول نین پروانہ، کندن لال، ٹھاکر پونچھی اور پریم ناتھ دھر وغیرہ ریاست سے باہر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں تلاشِ معاش کی خاطر بکھر گئے لیکن انہوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پریم ناتھ پردیسی وفات پا گئے۔ مولا رامکوٹی اور موہن یاور نے روزگار کے طور پر صحافت کا کام سنبھالا لیکن کبھی کبھار افسانے بھی تخلیق کرتے

رہے۔ بالخصوص موہن یاور۔

تقسیمِ وطن کے بعد کچھ عرصہ تک ریاست جموں وکشمیر کی ادبی فضا پر جمود و تعطل کا عالم طاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات سُدھرے تو یہاں کے ادبی اُفق پر کچھ نئے چہرے اُبھرے جنھوں نے اُردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اِن میں علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، برج کتیال، حامدی کاشمیری، برجؔ پریمی، غلام رسول سنتوش، اختر محی الدین، صوفی غلام محمد، نور شاہ، غ.م. جانباز، امیش کول، بنسی نردوش، جگدیش بھارتی، مخمور بدخشی، شبنم قیوم، رام کمار ابرول اور ویدراہی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن میں سے بہت سے افسانہ نِگاروں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُردو زبان میں لکھنے سے کیا لیکن پھر کشمیری یا ڈوگری کی طرف مائل ہو گئے۔ اِن میں علی محمد لون، اختر محی الدین، جگدیش بھارتی، بنسی نردوش، امیش کول اور غلام رسول سنتوش کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے کشمیری میں افسانے تخلیق کیے۔ علی محمد لون نے اگرچہ کشمیری میں لکھ کر اپنے لیے ایک خاص مقام بنا لیا۔ لیکن اُنھوں نے اُردو کے ادبی سرمائے میں بھی بہت سے اِضافے کیے۔ اُنھوں نے ''مونچھوں والی گڑیا''، ''پاپی پجارن کی سنتان''، اور ''بُت شکن'' جیسے کئی ڈرامائی انداز کے افسانے لکھے۔ اختر محی الدین نے ''پونڈرچ''، ''پیوند'' اور ''رات مرگئی'' اور ''اہیرن'' جیسے عُمدہ اُردو افسانے لکھے۔ غلام رسول سنتوش نے جو کہ بُنیادی طور پر ایک مصور اور شاعر ہیں ''خزاں کی خوشبو''، ''ایک موت ایک مسکراہٹ''، ''یہ قربتیں، یہ دُوریاں'' اور ''ڈل کے باسی'' نامی افسانوں میں مصورانہ اور شاعرانہ جدت پیدا کی ہے۔ رام کمار ابرول اور ویدراہی نے ''کالے ہاتھ'' اور ''شگوفہ'' جیسی اچھی کہانیاں لکھیں۔ اِس دور کے افسانہ نِگاروں میں حامدی کاشمیری، نور شاہ، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ اور برج پریمی نے اچھا لکھا۔ برج کتیال، شبنم قیوم اور مخمور بدخشی نے درمیانہ روش اختیار کی۔ غ.م. جانباز اور صوفی غلام محمد نے آزادی کے بعد بہت کم لکھا بلکہ لکھنا ہی ترک کر دیا۔

حامدؔی کاشمیری کے ابتدائی افسانوں پر معاشرتی اور اصلاحی رنگ غالب ہے رومان کی خوشبو بھی ملتی ہے مگر بعد کے افسانوں میں جدیدیت کی بو باس زیادہ ہے۔ ''سراب''، ''سندری''، ''وادی کے پھول''، ''برف میں آگ'' اور

''آگ ہے اور دھواں نہیں'' افسانوں میں جہاں شعری پیکر تراشیاں ہیں وہاں مشاہدے کی باریکی اور غور وفکر کی گہرائی کے ساتھ جنس کا شدید احساس بھی ملتا ہے اور حسن وعشق کی حقیقی داستانوں کی چاشنی بھی۔ حامدیؔ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ اِس لیے اُن کے اِن افسانوں میں شعریت، فن کی اہمیت، کشمیری کلچر اور عوام کی نفسیاتی زندگی کی تہہ در تہہ کڑیاں یکجا ملتی ہیں۔ حامدیؔ کاشمیری نے عرصہ ہوا افسانوی ادب تخلیق کرنے سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور شعر وشاعری اور تنقید کی طرف ہمہ تن توجہ دے رہے ہیں۔

تیج بہادر بھان کا افسانہ ''جہلم کے سینے پر'' اپنے جلو میں کشمیر کا مخصوص ماحول لیے ہوئے ہے۔ ''عورت''، ''جوتے'' اور سہارا'' افسانوں کے ذریعہ اُنھوں نے جموں وکشمیر کے عوام کے دِلوں کی ہو بہو ترجمانی کی ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار چلتے پھرتے دِکھائی دیتے ہیں، اور ریاست کی عوامی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِن کے افسانوں پر کشمیری زبان کے لب ولہجہ اور محاوروں کا کافی اثر ہے۔

پشکر ناتھ ایک حقیقت نِگار ہے۔ اِسی لیے اِن کے افسانوں میں حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ وہ بدلتی فضاؤں کے ترجمان ہیں۔ ''اندھیرے اُجالے''، ''ڈل کے باسی''، ''آس نراس'' اور ''گلدان'' افسانے نُدرتِ خیال، اندازِ بیان اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے اعلیٰ فنی نمونے ہیں۔ اِن افسانوں میں حقیقی زندگی، اِس کے مسائل، اِن کا عمیق مطالعہ اور احساس وفکر کی مکمل ہم آہنگی مِلتی ہے۔ ''گالی''، ''گاشری اور پردہ نشین'' افسانوں میں اچھے کردار ملتے ہیں جو جموں وکشمیر کے ہی پروردہ ہیں۔

نور شاہ کے افسانوں میں رومانی شاعرانہ تخیل طرازیاں سب سے زیادہ ہیں۔ اِن کے اِبتدائی افسانے سے لے کر اس وقت تک سبھی افسانوں میں یکساں اور ہموار فضا ملتی ہے جس نے اُن کے افسانوں کو ایک محدود دائرے میں مقید کر دیا ہے۔ مگر اِس کے باوجود ان کے افسانوں میں ''زخم خوردہ دِلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔''[۱] ''ایک رات کی ملکہ''، ''بے گھاٹ کی ناؤ''، ''ویرانے کے پھول'' اور ''من کا آنگن اُداس اُداس'' افسانوں میں حقیقی معنوں میں اِن میں زخم

خوردہ دِلوں کی دھڑکنیں ہیں۔ 'انداز شگفتہ، مگر بے ساختہ نہیں ہے۔ اِبتدائی افسانوں میں مشاہدے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ''سُوکھی ندی کا گیت''، ''لمحے اور زنجیریں''، ''پتھر اور اِنسان'' افسانوں میں زندگی کے اِنفرادی اور خارجی پہلوؤں کو اُجاگر کر کے تلخ اور حسین لمحات کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے۔

مخمور بدخشی کے افسانوں میں بقول ڈاکٹر محی الدین زورؔ ''ان کی گفتگو اور اندازِ طبعیت کے خلاف مُسکراہٹیں کم اور طنز زیادہ ہے۔ اُنھوں نے ہنستے چہروں سے زیادہ افسردہ دِلوں کو پیش کیا ہے اور ہوس کاروں اور مکاروں پر بھرپور طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔''[۲] 'نیل کنول مسکائے''، ''عبداللہ دیوانہ''، ''یہ خلش کہاں سے ہوتی'' اور ''ہار جیت'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں اول تو مشاہدے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ دوم وہ کشمیری محاورات کے براہِ راست لفظی ترجمے کر جاتے ہیں جن کی وجہ سے کہانی کا مزہ کِرکِرا ہو جاتا ہے۔

مخمور بدخشی کا افسانوی سرمایہ بس ''نیل کنول مسکائے'' مجموعہ ہے۔ بعدازاں اُنھوں نے لکھنا ترک کر دیا اور اب تو یقین بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ''نیل کنول مسکائے'' مجموعے کے افسانوں کا خالق یہی شخص ہے۔ اِس طرح سے ڈاکٹر زورؔ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا کہ''..... وہ مجھے یقین ہے کہ کشمیر کا یہ اُبھرتا ہوا فن کار اگر اِسی طرح مصروفِ تخلیق رہے تو اُردو کے افسانوی ادب میں اپنا نام پیدا کر سکے گا اور اپنے وطن کو تمام اُردو دُنیا میں باعزت طریقے سے روشناس کرنے کا باعث بن سکے گا۔''

برج کتیال، شبنم قیوم اور برج پریمی نئی فضا اور نئے رُجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تخیلی تانے بانے کم اور حقیقت پسندانہ عناصر بہت زیادہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے چٹخارے اور عام ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ طنز کا عنصر بھی وافر ملتا ہے۔ برج کتیال کے ''موت کے راہی''، شبنم قیوم کے ''لوہا پگھلتا ہے''، ''پانی کا دھواں''، ''بہت اونچے بہت نیچے'' اور برج پریمی کے ''یادوں کی خوشبو''، ''سپنوں کی شام'' افسانوں میں بیسویں صدی کے مشینی دور کے اِنسان کا کرب ملتا ہے۔

کشمیر کے قدرتی حسن اور کشمیریوں کی سادہ دِلی کے حوالے سے انھوں نے کئی کامیاب رومانی افسانے لکھے ہیں۔ اِن کے افسانوں کا مجموعہ گیلے پتھروں کی مہک کے نام سے بہت پہلے شائع ہوا تھا۔ تازہ تریں مجموعہ ''بے ثمر سچ کے نام سے ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔

جموں و کشمیر میں اُردو افسانوی ادب کے لیے یہ دور نشاۃ ثانیہ سے کم نہیں۔ اِس دور میں جہاں نئے لکھنے والے سامنے آئے وہاں کہنہ مشق ادیب مثلاً ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، موہن یاور اور پشکر ناتھ بھی بدستور لکھتے رہے۔ اِسی دور میں ریاست جموں و کشمیر سے متعدد اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام عمل میں آیا۔ آزادی کے بعد عام تعلیم کی برکات سے ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع بہم ہوئے۔ اِسی طرح کلچرل اکیڈمی کا قیام بھی یہاں اُردو زبان وادب کے لیے فالِ نیک ثابت ہوا اکیڈمی نے ممکنہ حد تک ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی۔ انھیں مالی معاونت دی جانے لگی۔ اِن کی کتابیں چھپنے لگیں اور سیمنار اور مشاعرے کئے جانے لگے اِن سب سے اُردو زبان وادب کو کافی وسعت ملی۔ اُردو زبان وادب کے فروغ کے ضمن میں محکمۂ اطلاعات کی ادبی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ محکمہ اِطلاعات اُردو کا رسالہ تعمیر پابندی سے شائع کر رہا ہے۔

جموں و کشمیر کے ادبا نے اِس دور میں ایک طرف مُلک گیر پیمانے پر چوٹی کے اُردو ادیبوں کے اسلوب کی پیروی کی ساتھ ہی اپنے یہاں کے معاشی اور سماجی پہلوؤں پر بھی نِگاہ رکھی اور دُوسری طرف بین الاقوامی سطح پر مروج رُجحانات مثلاً مارکس کے معاشی اور فرائڈ کے جنسی خیالات کا اثر بھی قبول کیا اور اِس طرح سے انھوں نے مارکسزم اور تحلیلِ نفسی کے ساتھ ساتھ وجودیت، اشاریت، اظہاریت، تاثریت، شعور کی رو جیسے جدید نظریات ورُجحانات سے متاثر ہو کر افسانے تخلیق کرنے کی کوشش کی۔

اُردو افسانے کا یہ دُوسرا دور لگ بھگ ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۶۰ء کے آس پاس ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے

بعد نئے افسانہ نِگاروں کا ایک بہت بڑا قافلہ رواں دواں دِکھائی دیتا ہے۔ اِن میں مالک رام آنند، او. پی بشر ما سارتھی، وجے سوری، گیانچند شرما، سوم ناتھ ڈوگرہ، ہردے کول بھارتی، یش سروج، کلدیپ رعنا، ڈی. کے. کنول، امر مالموہی، ہری کرشن کول، راجیش گوہر، گھنشیام سیٹھی، ساگر کشمیری، ریاض پنجابی، ڈاکٹر ظہورالدین، موتی لال کپور، عمر مجید، عبدالغنی شیخ لداخی، نعیم اختر، شمس الدین شمیم، کشوری منچندہ، اجیت کمار بخشی، حسن ساہو اور جوتیشور پتھک کے نام خصوصی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اِن میں سے بہت سے افسانہ نِگاروں نے کشمیری، ڈوگری اور پنجابی میں بھی لکھا لیکن بہت سے اُردو میں ہی لکھتے رہے۔ چنانچہ جب ہم اِن افسانہ نِگاروں کی تخلیقات کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ موضوعات اور برتاو متنوع ہوتے ہوئے بھی اِن کے افسانوں میں جمہوریت، سوشلزم، مارکسزم، جدیدیت، طبقاتی کشمکش، ہندو چین اور ہندو پاک کی جنگیں، عرب و اسرائیل اور ویت نام و قبرص کے مظلوموں کی آہ و فغان کے مشترکہ حوالے سے احساسات ملتے ہیں۔ اِن میں موجودہ سائنسی، سماجی، سیاسی اور تکنیکی دور کے اِنسان کا درد و کرب بھی موجود ہے۔ خلائی کھوج اور تسخیر قمر نے ادب میں بھی نئی فضاؤں کا سماں باندھ دیا۔ مشینی دور نے ادب میں اِنسانی زندگی کی پراگندہ مزاجی اور نفسانفسی کو شدید تر کر دیا۔ اِن اِفسانوں میں ایک طرف سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کا ذکر ہے تو دُوسری طرف اِنسان کی کسمپرسی اور تنہائی کا گہرا احساس ملتا ہے۔

چنانچہ مالک رام آنند کے ''دہکتے پھول''، ''شبنم آنکھیں''، ''اپنے وطن میں اجنبی''، ''پایلٹ''، ''سُرخ برف زرد پتے''، یش سروج کے ''زمین پیاسی ہے''، ''خون کا قرض''، سومناتھ ڈوگرہ کے ''دو آنسو، دو خط، ایک کہانی''، ''میرے ارمان میرے سپنے''، امر مالموہی کے ''موت کی آرزو''، ''سحر ہونے تک''، ''انگارے''، کشوری منچندہ کے ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سِوا''، ''سڑک اِنصاف کرتی ہے''، ''بھوک''، ''الیکشن''، وجے سوری کے ''زندہ لاش''، ''خدا اور اِنسان'' او. پی بشر ما سارتھی کے ''درد''، ''مجرم کون؟''، ''اپنے وطن سے اپنے وطن میں'' اور گیانچند شرما کے ''بنجر دھرتی بنجر لوگ'' اِن افسانوں میں نہ صرف یہ کہ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی اُلجھنیں ہیں بلکہ حقیقت و رومان کا ایک

دِل نشین سنگم بھی ہے۔ اِن کے افسانوں میں دُکھ درد، غم، پریشانی، ماضی کی تلخیاں، حال کی کشمکش، مستقبل کی مایوسی کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کی تقسیم کے اثرات، گاہ بگاہ وجود میں آنے والی جنگیں اور ان کا عوام پر ردِ عمل کے پرتو ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن افسانوں میں حال کی تاریکیوں کو پھاندنے اور مستقبل کے اُجالوں کی نشاندہی بہت کم ملتی ہے۔

۶۵۔۱۹۶۰ء کے آس پاس ادبی اُفق پر پھیلتے ہوئے جدیدیت کے رجحان نے یہاں کے نئے اور پرانے افسانہ نِگاروں کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا اور اِن فن کاروں نے اِن جدید میلانات ورُجحانات سے متاثر ہو کر بہت ہی خوبصورت افسانے تخلیق کیے۔ اِن میں کلدیپ رعنا کا ''ایک خط، ایک گیت''، ''زندگی''، ہری کرشن کول کا ''کتے کی دم''، راجیش گوہر کا ''سہاگ بنا رہے''، گھنشیام سیٹھی کا ''ایک شام''، اجیت کمار بخشی کا ''اس کا اور میرا سچ''، ''شرمیلا''، ڈاکٹر ظہور الدین کا ''نجات' ورِ شہسوار''، ساگر کاشمیری کا ''زلزلہ''، ریاض پنجابی کا ''لمحوں کی صلیب''، موتی لال کپور کا ''برج کا باسی''، عمر مجید کا ''پرچھائیاں''، نعیم اختر کا ''بہار آئی چمن میں مگر خزاں کی طرح''، عبدالغنی شیخ کا ''لوسرا اور آنسو''، ''مسکراہٹ''، شمس الدین کا ''اُنگلیاں''، ''دُوسری صلیب''، اور حسن ساہو، جوتیشور پتھک کے کچھ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جنھوں نے ادب اور فن کو جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ کیا اور فنِ افسانہ کے لیے نئی راہیں متعین کیں۔

جموں وکشمیر میں ۱۹۷۰ء کے بعد اُردو افسانے نے یہاں کے بہت سے نئے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور پرانے کہنہ مشق ادباً کے ساتھ ساتھ نوجوان افسانہ نِگاروں نے بھی قدم ملا کر چلنا شروع کیا اور ریاست میں افسانوی ادب کے ایک خوش آئند دور کی نوید سُنائی۔

۱۹۷۰ء کے بعد دُنیا کے نقشے میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ ثقافتی، سماجی، سیاسی اور ادبی اُفق پر بھی متاثر کن حالات نے کروٹ لی۔ ادیب اور فن کار کو بھی اِن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور اس نے اپنے ماحول میں پیدا شدہ پراگندہ مزاجی کا حل تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اِس طرح سے ۱۹۷۰ء کے بعد ریاست میں ایک نئے دور کا سِلسِلہ شروع ہوتا ہے اور افسانوی ادب میں یہاں کئی ایسے نوجوانوں کا اضافہ ہوا جن سے حوصلہ افزا توقعات وابستہ ہوگئی ہیں اور دس

بارہ برس کے اِس مختصر عرصے میں انھوں نے جن کامیابیوں کو جا لیا ہے، ان ہی یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صنفِ ادب ریاست میں مسلسل فروغ اور نشو ونُما پا رہی ہے اور اس کا دامن اِس قدر وسیع اور دقیع ہے کہ اِس میں تعطل اور جمود پیدا ہونے کے دُور دُور تک امکانات نہیں ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد پرانے لکھنے والوں میں سے ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، نُور شاہ، کشمیری لال ذاکر، شبنم قیوم اور پریم ناتھ در وغیرہ نے حالات کے تقاضوں، سماجی ضرورتوں اور فنی نزاکتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے افسانے تخلیق کیے۔ پریم ناتھ در نے ''سڑے پھسے ٹماٹر''، تیج بہادر بھان نے ''رنڈی اور بچّے''، ''دو بھائی''، شبنم قیوم نے ''دُکھتی آنکھیں''، ''جہاں اِنسان دفن ہے''، ''دیوی دیوتا''، نُور شاہ نے ''ایک ادھورا ناول''، ''لمحوں کا سفر''، پشکر ناتھ نے ''جوڑا ابابیلوں کا''، ٹھاکر پونچھی نے ''موت کی موت''، ''سفیدے کا درخت''، وغیرہ بہت اچھی کہانیاں لکھیں۔ اِن کے ساتھ ساتھ کشوری منچندہ نے ''سڑک انصاف کرتی ہے''، ''میں سوداگر نہیں''، ''روش سے ہٹ کر''، کلدیپ رعنا نے ''لکیریں''، ریاض پنجابی نے ''بے نام''، جوتیشور پتھک نے ''ٹوٹے رشتوں کا روگ''، ''غمگین''، غلام نبی نے ''دل کی بات''، وجے سوری نے ''زخم''، شمس الدین شمیم نے ''پھاوڑے کی بیٹی''، ''کچھ دِن کی صدی''، عبدالغنی شیخ نے ''گنجوں کی کہانی''، ''آرزوئیں''، مرزا محمد زماں آزردہ نے ''اور وہ ٹاپ گئی''، ''اسیرِ وقت''، ''شامِ غم''، حسن ساہونے ''پھول کا ماتم''، ''ایک ہستی تین روپ''، ''دیوالی کے دیپ، عمر مجید نے ''تاریخ ساز'' اور ''جہلم بہتا رہا''، ''بادشاہ''، سلمیٰ فردوس نقاش نے ''سلومی''، نزہت داوری نے ''آسیب زدہ چنار'' اور ڈاکٹر ظہور الدین نے ''منگولیا کا قاتل'' جیسے علامتی اور تجریدی افسانے لکھ کر ریاستی افسانوی ادب میں جہاں قابلِ قدر اضافہ کیا وہاں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

۱۹۷۴ء میں ریاست کے افسانوی ادب میں چند ایک کو چھوڑ کر کئی نئے چہرے سامنے آئے، اِن کو سامنے لانے میں ڈاکٹر بشیر گاش اور یسٰین فردوسی کا کافی ہاتھ رہا ہے۔ ڈاکٹر بشیر گاش نے جن نئے فن کاروں کی تخلیقات پر

مبنی مجموعہ ''ارمغانِ کاشمر'' ترتیب دیا۔ اسے یسٰین فردوسی نے شائع کیا۔ لیکن افسوس اِس بات پر ہے کہ سارھے تین سو صفحات کے اِس مجموعے میں ریاست کے صرف خطۂ کشمیر کی نمائندگی ہے۔ جموں اور لداخ کے ادیبوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اکتیس افسانہ نِگاروں کی تخلیقات پر مبنی یہ افسانوی مجموعہ ریاستی افسانوی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس مجموعے کی بدولت بہت سے نئے افسانہ نِگاروں کی شناخت ہوتی ہے۔ (گومرتب نے کشمیر کے بہت سے افسانہ نِگاروں کو بھی اِس میں شامل نہیں کیا ہے۔)

اِس مجموعے میں رابعہ دلشاد، فرحت آرا حیدری شمیمہ اختر، ایم نسأ نسیم جہاں، رفیقہ عارف، نیلوفر شاہ، عمر مجید، شمس الدین شمیم، نذیر شہناز، م.م.صدیق، ایس.ایم قمر، اے.اے.رضوی، عبدالاحد بٹ، نذیر مشاق، بھوشن لال بھوشن، مصطفٰے جوہر، مرزا محمد زماں آزردہ، طاہر رحمان، الطاف شیرا، عبدالرشید فراق، شیخ بشیر احمد، حشمت مختار، نیاز احمد جان، زاہد منظور، خالد بشیر، نذیر شیدائی، یسٰین فردوسی، ظہور احمد شاعر، دین محمد شمع، اور بشیر گاش کے بالترتیب ''کرب کی صلیب''، ''زودِ پشیماں''، ''پیاسے سپنے''، ''گوری دُشمن''، ''رشتہ''، ''ایک زخم ہرا سا''، ''میرے وطن''، ''سڑک''، ''فنکار''، ''واپسی''، ''تیسرا پتھر''، ''روشنی کے کیڑے''، ''آخری موڑ''، ''دھماکہ''، ''شہر کا قہر''، ''سولہ نمبر''، ''گرد اور آئینہ''، ''مداوا''، ''ساحل کا تھپیڑا''، ''دوسری لڑکی''، ''دھند''، ''انوکھی عورت''، ''آگ کی گڑیا''، ''روشنی''، ''بے وفا مورتیاں''، ''لیلیٰ''، ''اندھیرا''، ''ادھوری بات''، ''اگالدان'' افسانے شامل ہیں۔ اِن افسانہ نِگاروں میں بہت سے ابھی اندھیروں میں ہی بھٹک رہے ہیں۔ اِن تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعض افسانہ نِگاروں کو ابھی تک افسانے کی تکنیک بھی معلوم نہیں ہے۔ بعض کے ہاں مشاہدات و تجربات کا فقدان اور بعض کما حقہ آگاہی رکھتے ہیں۔

زبان و ادب کے فروغ اور اِس کی ترقی و ترویج میں رسائل کا بہت ہی اہم حصّہ رہا ہے۔ یوں بھی ادیب کے بس کی بات نہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کا مجموعہ شائع کرے اور قارئین مستفید ہوں۔ اِس کمی کو صرف رسائل ہی پورا کر سکتے ہیں۔ اِس سِلسِلے میں ریاست جموں و کشمیر میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ساتھ ساتھ ادبی و نیم ادبی رسائل

میں ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب'' (کلچرل اکیڈیمی) اور ''تعمیر'' (محکمۂ اطلاعات) کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ اِن دو رسالوں نے کئی افسانہ نِگاروں کو عوام سے متعارف کروایا۔ اِن کے علاوہ بیرون ریاست سے نکلنے والے رسائل آج کل، شاعر، بیسویں صدی، ہمارا دور وغیرہ میں بھی ریاستی ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں اور بھی کئی ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ اِس سلسلے میں شیرازہ کے افسانہ نمبر اور ۱۹۷۹ء سے ہر سال شائع ہونے والے نوجوان نمبر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شیرازہ کے اِن خاص شُماروں کی بدولت ہم اِن نئے افسانہ نِگاروں کی تخلیقات سے واقف ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں اُردو، کشمیری، ڈوگری اور پنجابی افسانوں پر مبنی شیرازہ کا افسانہ نمبر شائع ہوا۔ اِس خاص نمبر میں اُردو کے سولہ، کشمیری، ڈوگری اور پنجابی افسانوں کے اُردو میں بالترتیب بیس اور چار چار تراجم شامل ہیں۔ اُردو افسانہ نِگاروں میں تیج بہادر بھان (تلاش)، نور شاہ (میرے دوست کی بیوی)، او. پی شرما سارتھی (اپنا ایک سفر)، ڈاکٹر برج پریمی (خوابوں کے دریچے)، عبدالغنی شیخ (ڈی لائٹ تھیٹر سے گھر تک)، شبنم قیوم (چھٹکارہ)، عمر مجید (یہ شام بھی کہاں ہوئی)، شمس الدین شمیم (عمارت)، امر مالموہی (احساس کا کرب)، جوتیشور پتھک (اُداس لمحوں کا سفر)، راجہ نذر بونیازی (کئی تنکے کئی سورج)، غمگین غلام نبی (افسانہ)، ڈی. کے. کنول (شِکست)، روشن لال روشن (آواز کا گھاؤ)، مسعود سامون (.....اور قطرہ ٹپکا)، اور یٰسین فردوسی (باجی) کے افسانے شامل ہیں۔ اِن افسانوں میں ان کا اپنا وہی اسلُوب اور اندازِ بیان ہے جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اپنے اِبتدائی مراحل طے کیے ہیں۔ البتہ او. پی. شرما سارتھی، برج پریمی، شمس الدین شمیم، امر مالموہی، عمر مجید، راجہ نذر بونیاری، غمگین غلام نبی اور مسعود سامون کے افسانے جدیدیت کے حامل ہیں۔ اِن میں تجربات اور مشاہدات کا انوکھا پن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اُنھوں نے اپنے ان افسانوں میں افسانے کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جہاں تک اُردو میں کشمیری افسانوں کے تراجم کا تعلق ہے، یہ افسانے اپنے ماحول، کردار نِگاری، پلاٹ کے

علاوہ فنی اور تخلیقی اعتبار سے جہاں جدت وندرت کے حامل ہیں وہاں یہ عوامی زندگی کی کے بھی بہت قریب ہیں اور شائد یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ کشمیر میں اُردوٗ کی طرح کشمیری زبان میں بھی نئے تجربوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا جارہا ہے اور کشمیری افسانہ اُردوٗ افسانہ سے بہت پیچھے نہیں ہے۔ شائد اِس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ریاست کے اِبتدائی اُردوٗ ادیب ہی اب پوری تندہی کے ساتھ کشمیری زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اِن میں علی محمد لون، اختر محی الدین، امین کامل، غلام رسول سنتوش، شنکر رینہ، فاروق مسعودی، ہردے کول بھارتی، بشیر اختر، اوتار کرشن رہبر، ناصر منصور، گلشن مجید اور غلام محمد آجز کے افسانے بالترتیب ''آگے کوئی نہ پیچھے''، ''سانحہ''، ''بھک منگے''، ''سنگِ مزار''، ''لکیریں اور نقطے''، ''کوہِ قاف پر''، ''پری جن اور ہیروٗ''، ''رشی والمیکی لکھ رہے ہیں''، ''فلمی ٹریلر''، ''نروان زندہ رہنے کے لیے''، ''میرے خوف کی کہانی''، ''چھٹی بستی کا بند دروازہ'' قابلِ ذکر اُردوٗ تراجم ہیں۔ اِن افسانوں میں علامتی اور تجریدی فن کی عکاسی بھی ملتی ہے اور قدیم اقدار کی توڑ پھوڑ کے ساتھ جدید ذہن کی پراگندہ مزاجی اور ایک ایسے اِنسان کی کہانی بھی ملتی ہے جو اِس مشینی اور تکنیکی دور میں کچھ ایسا کھو گیا ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود اس کی بازیافت ناممکن سی ہوگئی ہے۔ اِن افسانہ نِگاروں نے ادبی اُفق پر رونما ہونے والے جدید رُجحانات کا بالواسطہ اثر قبول کیا ہے اور اِن میں کشمیری رنگ روپ سے مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ اِس اعتبار سے بشیر اختر اور فاروق مسعودی قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں کے ہاں بظاہر جنسی پہلو ہے مگر بغور مطالعہ کے بعد مسعودی کے ہاں تو جنسی جذبات علامتی انداز میں محض تشنگی کا باعث بنتے ہیں۔ جن سے ذہنی نا آسودگی اور جنسی انگیخت ہویدا ہے لیکن بشیر اختر کے ہاں جنس کا برتاوٗ بھرپور علامتی انداز میں ہے۔ اُن پر سعادت حسن منٹو کا کافی اثر دِکھائی دیتا ہے۔ لیکن علامتوں کے برتنے میں اِن کا انداز منفرد ہے اور اگر وہ اِسی انداز سے افسانے تخلیق کرتے رہے تو وہ دُوسرے کشمیری افسانہ نِگاروں کو بہت پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔

ڈوگری اور پنجابی کہانیوں کے تراجم میں نریندر کھجوریہ کا ''برگِ آوارہ''، بندھوشرما کا ''یادوں کے جھروکے''، ڈاکٹر منوج کا ''ایک وار، کئی گھاوٗ''، ادم گوسوامی کا ''چکی''، ڈوگری میں، اور پنجابی میں سرن سنگھ کا ''دھوپ''، کنول

کشمیری کا ''دھبہ''، خالد حسین کا ''ادھورا تاج محل'' اور پریم سنگھ کا ''محنتی''، سماجی، اصلاحی، جدید اور علامتی سبھی قسم کے قابل مطالعہ افسانے ہیں۔

جہاں تک ڈوگری، پنجابی اور کشمیری افسانوں کے اُردو تراجم کا تعلق ہے یہ گاہ بگاہ شائع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ البتہ اِس سِلسِلے کی ایک اہم کڑی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والے ایک اور مجموعے کا نام لینا بہت ضروری ہے کہ جو ''پربت اور پنگھٹ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کلچرل اکیڈیمی کا ایک ایسا سِلسِلہ ہے جس کے تحت اب تک دو جلدیں شائع ہوئی ہیں اور اِن میں کشمیری اور ڈوگری دونوں زبانوں کے اہم اور چوٹی کے افسانہ نِگاروں کے افسانے شامل کیے گئے ہیں جن کا اپنی زبان میں ایک مستند مقام ہے۔

نوجوان افسانہ نِگاروں کو ریاست اور بیرونِ ریاست کے ادیبوں سے روشناس اور متعارف کروانے کی غرض سے ریاستی کلچرل اکیڈمی نے ان کی تخلیقات پر مبنی ہر سال شیرازہ کا ایک خاص شمارہ نوجوان نمبر شائع کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اِس سِلسِلے کی سب سے پہلی کڑی ۱۹۷۹ء کا نوجوان نمبر ہے۔ اِس وقت تک اِس کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اِس کی بدولت اِن نوجوان افسانہ نِگاروں کے اندازِ فکر، طرزِ تحریر، وسیلۂ اِظہار اور طریقۂ پیش کش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست کے ان اُبھرتے ہوئے افسانہ نِگاروں میں انیس ہمدانی، غلام رسول آزاد، آنند لہر، عبدالرشید فراق، نظیر نذر، جان محمد آزاد، محمد شریف دانش، عبدالرشید خان راہ گیر، یسٰین فردوسی، دِلکش مقبول، الطاف ناؤپوری، مشتاق مہدی، زاہد مختار، اظہر نعیمہ احمد، فاروق رنیزو، بھوشن لال بھوشن، کے. ڈی. مینی، ریاض ماہر، صوفی بشیر بشر، مقبول احمد، تمنا منشی، مطربہ معصوم، خالد بشیر، اشرف آثاری، اشوک پٹواری اور غلام نبی شاہد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اِن کے افسانوں میں موجودہ ماحول کی، اس بے چینی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے جس سے نوجوان نسل دوچار ہے۔ اِن میں ایک درد و کرب ملتا ہے جس کی بدولت نوجوان طبقہ زندگی کی اُلجھنوں میں اِس طرح اُلجھ کر رہ گیا ہے کہ اُلجھنوں کی اِن بھول بھلیوں سے باہر نکالنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا ہے۔ اِن افسانہ نِگاروں میں سے بلاشبہ بہت سے لوگوں کو افسانہ نِگاری کا خاصا اچھا سلیقہ

ہے اور یہ اپنے اس ماحول کے حقائق کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اِس کے باوجود اِن کے یہاں زندگی اور اس سے متعلق پیچیدگیوں کا احساس قوی نہیں ہے اور بعض کے یہاں مشاہدے کی کمی اور احساس کی ناپختگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لیکن مسلسل کاوشوں سے جہاں یہ باتیں دُور ہونے کا امکان ہے وہاں تجربات اور مشاہدات کی بدولت اسلُوب میں پختگی اور تیکھا پن بھی ازخود آنے کی اُمید بھی ہے۔ اِن افسانہ نِگاروں کے افسانوں میں انیس ہمدانی کا ''آہٹ مکمل ہونے تک''، غلام رسول آزاد کا ''شہر کا مرکز''، آنند لہر کا ''اندھی روشنی''، ''ٹرین کا ڈبہ''، ''جواب''، ''پانی کی لکیریں''، ''عدالت''، ''نظیر نذر کا''، ''میں کی واپسی''، ''ہولی''، محمد شریف دانش کا ''شہکار''، خالد بشیر کا ''دُھندلے نقوش''، زاہد مختار کا ''کسوٹی''، ''تخلیق کے گھاؤ''، صوفی بشیر بشر کا ''بے زبان''، فاروق ریزو کا ''آخری داؤ''، ''آواز کا سایہ، کے .ڈی. مینی کا ''پہلا پتھر''، ''چاند''، ''مطربہ معصوم کا''، ''اُمیدوں کا پتھر'' اور دلکش مقبول کا ''بیمار مسیحا''، اشرف آثاری کا ''نئے اُفق کی تلاش''، تمنا منشی کا ''اُجالے اندھیرے''، تمثیلی، تجریدی اور جدیدیت کے حامل افسانے ہیں۔ اِن افسانوں میں افسانہ نِگار کے اِن تجربات کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں لوگوں کی بھیڑ میں بھی اسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنی ہر شے بلکہ اپنا آپ تک کھو بیٹھا ہے اور اُسے اُس کی ازسرِ نو تلاش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ فن کار موجودہ ماحول سے فرار ہو کر پھر کہیں گوشہ نشینی اور صوفی کی زندگی نہ گزارنے لگیں جس میں اُن کی بقا اور سالمیت پنہاں ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی ادب میں گذشتہ دس برسوں میں قابلِ قدر اِضافہ ہوا ہے۔ متذکرہ نوجوان ادبا جن بزرگ اور کہنہ مشق افسانہ نِگاروں کے ساتھ مل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے بھی اپنے قلم کی سیاہی خشک نہیں ہونے دی ہے۔ بلکہ حالات و واقعات، تجربات و مشاہدات اور ترسیل و ابلاغ کے اِس اژدہام میں اُنھوں نے اپنے اشہبِ قلم کی جولانیاں اور تیز کر دی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیری لال ذاکر نے ''تین پیڑوں والا مکان''، تیج بہادر بھان نے ''یہ ادارے یہ رُجحان''، نور شاہ نے ''گیلے پتھروں کی مہک''، ''دوسرے شوہر کی خواب گاہ''، ''پُل صراط''، موہن یاور نے ''میرے دوست کی لاش''، ''صندلی گلی کے موڑ پر''، پشکر ناتھ نے ''غبارے رنگ برنگے''، ''پُل

نمبر صفر کے گدھ''، ''موالی''، کشوری منچندہ نے ''تکون کا کرب''، ''یادوں کا دھواں''، ڈی. کے. کنول نے ''روپ بہروپ''، مالک رام آنند نے ''اُلٹی گنگا''، عمر مجید نے ''شہر کا اغوا''، ''جب راستے اُلجھ جاتے ہیں''، ''سب سے بڑا غم''، ڈاکٹر بشیر گاش نے ''شکست''، ویریندر پٹواری نے ''فرشتے خاموش ہیں''''ڈرپوک''، ''وہ عورت''، ''وقت وقت''، ڈاکٹر ظہور الدین نے ''اوڈی سوز، کینی بلز''، ''ٹوٹے شیشے کا کرب''، شمس الدین شمیم نے ''مسلسل سفر''، ''میزان''، حسن ساہو نے ''حالات کی ضرب''، ''خالد حسین اِ نے ''ٹھنڈی کانگڑی''، ''کھوکھلا سورج''، ''گوری فصل کے سوداگر''، ''سورج کا گیت'' جیسے افسانے لکھ کر اِن میں سیاسی بحران، نفسیاتی کشمکش، اخلاقی قدروں کا فقدان، سماجی اور معاشی مسائل اور جنسی بے راہ روی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اِن میں سے بہت سے افسانے فن اور اسلُوب کے لحاظ سے علامتی اور تمثیلی ہیں اور کچھ افسانے فنی تجربے کے اعتبار سے بھی ایک قابلِ قدر اِضافہ ہیں۔ جن میں سے ڈاکٹر ظہور الدین کے طویل افسانے ''اوڈی سوز'' کا ذکر کرنا دِلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اپنی طرح کا اُردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہے جس کو انجام تک پہنچانے میں افسانہ نِگار آزاد منظوم لہجے میں شعور کی رو، سررِیلزم اور اشاریت سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، کشمیری لال ذاکر اور موہن یاور کے افسانوں میں فن اور تجربہ کی پختگی اور مشاہدے کی گہرائی کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ خصوصاً پشکر ناتھ کے افسانہ ''پُل نمبر صفر کے گدھ'' بڑے معرکے کا افسانہ ہے، نور شاہ کے افسانوی مجموعے ''گیلے پتھروں کی مہک'' میں انداز تو وہی پُرانا ہے، البتہ نئے جنسی تجربات کی فضا پُوری قوت کے ساتھ حاوی ملتی ہے۔

جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کا مستقبل بڑا تابناک دِکھائی دیتا ہے کیوں کہ اِس صنفِ ادب میں جدید فنی تقاضوں اور نئے رُجحانات اور میلانات کو مدِ نظر رکھ کر کہنہ مشق افسانہ نویسوں کے ساتھ ساتھ نوجوان افسانہ نِگاروں کی جو پود آگے بڑھتی ہوئی دِکھائی دیتی ہے، اُنھوں نے اپنی خوردسالی کے باوجود مُلک گیر پیمانے پر اپنے زورِ قلم سے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہے اور یہ ریاست میں اُردو افسانہ نِگاری کے ایک خوش آئند مستقبل کی علامت ہے۔ نوجوان افسانہ نِگار جن کا ذکر اِس سے پہلے صفحات میں آ چکا ہے اِن میں سے انیس ہمدانی، آنند لہر، غلام رسول آزاد،

عبدالرشید فراقؔ، نظیر نذر، مشتاق مہدی، زاہد مختار، اشوک پٹواری، اظہر نعیمہ اختر، دِلکش مقبول، مقبول احمد، بھوشن لال بھوشن، فاروق رنیزو، خالد بشیر کے ساتھ ساتھ محمد شریف دانش، جاوید آذر، کے. ڈی. مینی، ہمراہ کشمیری لال، ایوب شبنم، اشرف آثاری، مطربہ معصوم، تمنا منشی، ڈاکٹر عبدالمجید، عبدالرحیم مغل، زینت فردوس زینت، واجدہ تبسیم (سرینگر)، غلام نبی شاہد، ریاض معصوم قریشی، ایس. ایم قمر، وحشی سعید ساحل، حمیداللہ بٹ، بیتاب جے پوری اور صوفی بشیر بشر سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔ نئے افسانہ نِگاروں کا یہ قافلہ جس مستعدی اور شوق سے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے اُس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ افسانوی ادب کا شجر آیندہ برسوں میں کافی تناور ہوگا۔ اِن افسانہ نِگاروں کے افسانوں میں نئے رُجحانات اور نئی فضا کی جیسی عکاسی ملتی ہے اور جیسا اِن کے اسلُوب کا تیکھا پن، لفظ و بیان کی دِلکشی، وارداتِ قلب کا اِظہار، حقیقت و رومان کا حسین اور دلفریب اِمتزاج، مشاہدہ و فکر کی ہم آہنگی اور نفسیات کا فن کارانہ تجزیہ مطالعہ میں آتا ہے، وہ ایک روشن مستقبل کی نشاندہی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ کچھ افسانہ نِگاروں کے ہاں زندگی کی پیچیدگیوں کا احساس پختہ نہیں ہے اور نو آموزی کی وجہ سے مشاہدہ بھی کچا ہے اور کہیں کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر خطابیت اور جذباتیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اِس سے انھیں بچنا چاہئے، زبان و بیان کی لغزشوں سے بھی احتراز کرنا چاہئے، کیوں کہ یہ خطہ اُردو کا ہوتے ہوئے بھی ''اُردو'' سے عاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اکثر اُردو ادیب زبان و بیان کی غلطیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اِس لیے ہمارے نوجوان ادبأ کو اِس جانب خصوصی توجہ دینی چاہئے۔

ایک اور بات جس کا ذکر یہاں پر ضروری ہے کہ عالمگیر پیمانے پر جو سائنسی، صنعتی، تکنیکی، ایٹمی اور علمی ترقی ہوئی ہے، ہندوستان بھی اِس میدان میں برابر آگے بڑھ رہا ہے اور اِس سے پیدا شدہ پیچیدگیوں سے یہاں کا ہر ادیب اور فن کار متاثر ہوا ہے۔ اور اِس کے نتیجے میں ادبأ نے جن اِنقلابی خیالات اور فکر و فن کے نئے رُجحانات کو جنم دیا ہے اُردو افسانے نے بھی اِس کے اثرات قبول کئے ہیں۔ چنانچہ اُردو میں جو اینٹی اسٹوری، علامتی اور تجریدی افسانے وجود میں آئے ہیں اور مُلک گیر پیمانے پر جوگیندر پال، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، انتظار حسین ظفر ادگانوی اقبال

مجید، اکرام باگ وغیرہ نے جو بغیر پلاٹ اور کردار کے تاثراتی افسانے لکھے ہیں اُنھوں نے اُن نوجوانوں کے ذہن کو اپنے تاثر اور شدت کی وجہ سے ایک طرف جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے اور دُوسری طرف بے کاری، بے روزگاری، جنسی بے راہ روی، اخلاقی اور سماجی قدروں کے انہدام نے اِن میں بے چینی، نفسیاتی پیچیدگی، گھٹن اور زندگی سے فرار کا جو احساس پیدا کیا ہے اُس کی بدولت نوجوان نسل ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں سے اُسے اپنے لیے راہ متعین کرنے میں بڑی دانشمندی اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ اِس سلسلے میں میرا یقینِ واثق ہے کہ نوجوان افسانہ نگاروں کی یہ نئی پود اپنے مشاہدات و تجربات کی ہم آہنگی، جدید میلانات اور رُجحانات کے حسین برتاؤ، علم و عمل کی یکسوئی، فن و ادب کی تکنیک سے آگاہی، اسلوب و تکنیک کی پیروی میں اِنفرادیت، فکر و خیال کی آزادی، نفسیات، وارداتِ قلب کے فن کارانہ تجزیوں اور وقتِ نظر اور وُسعتِ مطالعہ کے سہارے آگے بڑھتے ہوئے ریاست میں فنِ افسانہ نگاری کو نئی جہتوں اور نئی منزلوں سے روشناس و ہمکنار کروانے میں نہ صرف کامیاب و کامران ہوگی بلکہ ایک تابناک اور درخشندہ مستقبل کی امین و آئینہ دار بھی ہوگی۔

اکائی نمبر 15: جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب (انشائیہ، سفرنامہ، خاکہ، خودنوشت)

ریاست میں اُردو نثر کی ترویج واشاعت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بعض اہم اقدامات بھی اُٹھائے جن میں بدیا بلاس پریس اور بدیا بلاس اخبار کا اجرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جموں میں ایک دارالترجمے قائم کیا۔ اس دارے نے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع کیں اور بہت سے مسودے اُردو میں بھی ترجمہ کیا۔ اس ادارے نے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع کیں اور بہت سے مسودے اُردو میں بھی ترجمہ ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد (1857ء سے 1885ء) تک اُردو کو ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری اور درباری زبان کا درجہ حاصل تھا لیکن اُردو اس وقت بھی ریاست کے قریب قریب تمام علاقوں میں عمومی رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ چناں چہ رنبیر سنگھ کے ایک عہدہ دار چودھری شیر سنگھ نے 1856 سے 1864 کے دوران بخارا اور سمرقند وغیرہ کا سفر کیا اور واپسی پر اس نے اپنا سفرنامہ اُردو میں ہی تحریر کیا۔ اس سفرنامے کو ریاست کی پہلی باضابطہ اُردو نثری کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈوگرہ راج کے ایک بہت ہی بڑے عالم سالگ رام سالک نے ایک سفرنامہ لکھا جس کو 'تحفہ سالگ' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ابتدائی سفرنامہ اور ہے جس کی تاریخی اہمیت ہے۔ یہ سفرنامہ مہجور نے ''سفرنامہ لداخ'' کے عنوان سے ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ محمد یوسف ٹینگ نے اپنی کتاب ''مہجور شناسی'' میں لکھا ہے کہ یہ سفرنامہ لداخ اور کرگل کے 1909 کے بندوبست سے متعلق ہے اور سفرنامہ بلتستان کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں سفرنامہ نگاری، انشائیہ نگاری اور اُردو صحافت وغیرہ کا باقاعدہ ارتقاء 1947ء کے بعد ہی ہوتا ہے۔

ریاست میں غیر افسانوی نثر کی تاریخ میں ''سفرنامہ'' کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ سفرناموں کی صورت میں شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، غلام نبی خیال، خواجہ ثناء اللہ بٹ اور غلام نبی شیدا کے پانچ سفرنامے ہمیں روس، عراق

اور پاکستان کی فضاؤں میں پہنچا کر وہاں کی علمی، ادبی اور معاشرتی زندگی میں جھانک کر دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح بشیر بھدرواہی کا سفرنامہ ''رحمتوں کے سائے'' ہے جو سفر محمود کا ایک بہترین معلوماتی سفرنامہ ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شہاب عنایت ملک کا ایک نیشنل حدود کا سفرنامہ ''میری لکھنو یاترا'' ہے۔ جس میں سفرنامے کی خصوصیت کے ساتھ ڈرامائی عناصر بھی ملتے ہیں اور بہت ہی دلچسپ سفرنامہ ہے۔

حامدی کاشمیری نے جنوری 1986ء میں ہندوستانی ادیبوں کے وفد کے ساتھ ایک رکن کی حیثیت سے پاکستان کا سفر کیا۔ یہ دورہ ادبی نوعیت کا تھا۔ حامدی نے اس سفر کی دلچسپ روداد ''انجمن آرزو'' کے نام سے تحریر کی ہے۔ حامدی کا یہ سفرنامہ اختصار کے باوجود اپنے اندر رنگوں اور روشنیوں کی ایک دُنیا سموئے ہوء ہے۔ ''انجمن آرزو'' حد درجہ کا تاثراتی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔

''انجمن آرزو'' سے قبل شکیل الرحمان نے ''قصہ میرے سفر کا'' کے نام سے روس کے دورے کے تاثرات، مشاہدات اور تجربات قلمبند کیے ہیں۔ شکیل الرحمان نے اپنی عمر کا اکثر حصہ کشمیر میں ہی گذرا۔ ان ہی دنوں انہوں نے روس کا دورہ کیا۔ ان سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روس کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور وہاں کے معاشرے کے رنگوں کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ ان کا انداز بھی شخصی اور تاثراتی ہے۔ غلام نبی خیال کا ''سفرنامہ عراق'' بھی کافی دلچسپی کا حامل ہے۔ انہوں نے جولائی 1979ء میں عراق کا دورہ کیا اور اس سفر کی روداد اپنے اخبار روزنامہ ''اقبال'' میں 9 جنوری 1980ء سے لے کر اپریل 1980ء تک قسط وار شائع کیا۔ بعد ازاں انہوں نے اس سفرنامے کا خلاصہ اپنی کتاب ''کاروانِ خیال'' میں پیش کیا۔ غلام نبی خیال کا سفرنامہ تاثراتی بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ خیال نے اسے افسانوی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس سفرنامے کے مطالعے سے عراق کی تاریخ، ثقافت، معاشرت اور علم و ادب کے بہت سے پہلو روشن ہوتے ہیں۔

آفتاب کے مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ نے ''سفرنامہ پاکستان'' اپنے اخبار ''آفتاب'' میں قسط وار شائع کیا۔ مذکورہ

سفرنامہ ''بزم دوستاں'' کا رنگ لیے ہوئے ہے۔اس میں خواجہ نے کئی مصلحتوں کے تحت پاکستان میں صرف اپنے حلقہ احباب سے ملاقاتوں اور ہم جلیوں کا ذکر کیا ہے۔

''وادی کی آواز'' کے مدیر غلام نبی شیدا نے ایک سفرنامہ لکھا۔ چند سال قبل شیدا نے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے سفرنامہ کو اخبار میں قسط وار شائع کیا۔شید کے سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پروا ہوکر دل کی بات نوکِ قلم پر لے آتے ہیں۔جس کا اندازہ ''سفرنامہ پاکستان'' کے ابتدائی جملوں سے ظاہر ہوجاتا ہے۔

انشائیہ، خاکہ اور خودنوشت:

جہاں تک تعلق ہے انشائیہ نگاری کا: انشائیہ نگاری میں محمد زماں آزردہؔ کے کئی مجموعے فکر وشعور کی پھلجھڑیاں چھوڑتے نظر آتے ہیں۔خاکوں، انشائیوں اور رپورتاژ کے حوالے سے ہم شمیم احمد شمیم، سوم ناتھ زتشی، سوم ناتھ زتشی، غ۔م۔طاؤس اور ستار شاہد کی تحریریں بے حد اہم ہیں۔فکاہیہ تحریروں میں خواجہ ثناءاللہ بٹ اور شیخ خالد کرار کی تحریریں احساس وشعور کو چرکے لگاتی اور بیدار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔سرگزشتوں یا خودنوشت میں شیخ محمد عبداللہ (آتشِ چنار) سید میر قاسم (داستانِ حیات) سید علی گیلانی (قصہ دَرد)، ڈی ڈی ٹھاکور (یادوں کے چراغ) اور پروفیسر شہاب عنایت ملک (یادوں کے لمس) قابلِ ذکر ہیں۔

انشائیہ نگاری کے میدان میں محمد زمان آزردہ ادبی حلقوں میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ان کی انشائیہ نگاری تیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔آزردہ انشائیہ نگاری کے فن کی باریکیوں، نزاکتوں اور اس کی لطافتوں سے خوب واقف ہیں۔اُردو میں ان کے انشائیوں کے چھے مجموعے اب تک شائع ہوچکے ہیں۔ان کا اولین مجموعہ ''غبارِ خیال'' کے نام سے 1973ء میں شائع ہوا۔ بعد میں ''شیریں کے خطوط''، ''غبارِ کارواں''، ''کانٹے'' اور ''سُن تو سہی'' یکے بعد دیگر شائع ہوتے رہے۔اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ کشمیر میں انشائیہ نگاری کے ضمن میں نشتر کاشمیری، گنگا دھر دیہاتی اور تیرتھ کاشمیری کو اولیت حاصل ہے۔جنھوں نے 1947ء سے قبل ہی انشائیہ نگاری کے اولین نقوش قائم

کیے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حالات کی ناسازگاری کے سبب انشائیہ نگاری کی بیل منڈھے چڑھنے نہیں پائی۔ کشمیر میں انشائیہ نگاری کا دوبارہ آغاز محمود بیک نے کیا۔ مرزا محمود بیگ جموں وکشمیر یونی ورسٹی کے پروچانسلر ہیں۔ بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں لگ بھگ پانچ سال کشمیر میں مقیم رہے۔ اس دوران انہوں نے دیگر علمی وادبی مضامین کے علاوہ انشائیے بھی لکھے ہیں۔ جو نہ صرف ریڈیو کشمیر سے نشر ہوتے رہے ہیں بلکہ بیرونِ کشمیر کے رسائل اور جرائد میں بھی چھپتے رہے ہیں۔ جن میں ''میری جوشامت آئی۔۔۔شادی کی''۔ ''یہ بھی ایک فن ہے دوست بنانا'' ۔'' کیسے نبھائیں کماو بیوی سے''اور'' کیا ہوتا اگر اخبار نہ ہوتا'' ۔وغیرہ کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد محی الدین حاجنی، اختر محی الدین ، غ۔م۔طاؤس، ستار شاہد، محمد زمان آزردہ اور حال میں شیخ خالد کرار انشائیہ کے آسماں پر نمودار ہوئے۔

انشائیہ نگاری کے ضمن میں شمیم احمد شمیم بھی ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک شمیم احمد شمیم نے'' آئینہ'' کی ادارت کے دوران کئی معرکہ آرا انشائیے، خاکے اور فکاہیہ مضامین لکھے ہیں۔ یہ تحریریں'' آئینہ نما'' کے نام سے کتابی صورت میں کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے پطرس کے مضامین''لاہور کا جغرافیہ'' کی طرز پر'' کشمیر کا جغرافیہ'' کے عنوان سے پیروڈی بھی تحریر کی ہے۔ انشائیوں میں''بن بلائے مہمان'' اور خاکوں میں''ڈیڈی ''، شمیم احمد شمیم کی یادگار تحریریں ہیں۔ فکاہیہ تحریروں میں خواجہ ثناء اللہ بٹ بھی ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' کے علاوہ''خبر زینہ کدل'' کے عنوان سے بھی مزاحیہ تحریر میں پیش کی ہیں۔

شیخ خالد کرار کے فکاہیہ تحریروں کا مجموعہ'' کارِ زباں دراز ہے''۔ بے حد دلچسپ ہے اور شعوری کھڑکیوں کھولتا بھی ہے، دل میں ہلکی ہلکی گدگدی بھی پیدا کرتا ہے اور کہیں کہیں سنجیدہ احساس بھی دلاتا ہے۔ خالد کرار کے اس مجموعہ میں''غزل بہانہ کروں''،''ملاقات شاہِ خرستان سے''،'' کچھ غزل کی، کچھ چاند کی، چاند ماری''۔''ہم سب جلدی میں ہیں''۔ خاصے اہم فکاہیہ مضامین ہیں۔ آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ اور بھی کئی نئے نام ہیں۔ جنھیں اختصار کے سبب قلم انداز کیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جموں وکشمیر میں غیر افسانوی نثر کا بھی ایک وقیع سرمایہ موجود ہے جس پر تحقیق وپرکھ کی ضرورت ہے۔

اکائی نمبر 16: ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کے فروغ میں یونیورسٹی کے شعبوں، ریڈیو اور ٹی وی کا حصّہ

ریاست جمّوں وکشمیر میں جہاں ڈوگرہ حکمرانوں، ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے اُردُو کے فروغ کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا وہیں آزادی کے بعد یونی ورسٹی کے اُردُو شعبوں اور ذرایع ابلاغ مثلاً ٹی وی اور ریڈیو نے بھی اس زبان کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیے۔ تحقیق اور تنقید کے شعبوں میں کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردُو اور جمّوں یونی ورسٹی کے کارناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔

شعبۂ اُردُو کشمیر یونی ورسٹی کا قیام ۱۹۵۸ء میں عمل میں لایا گیا۔ اس شعبے کو ملک کے نامور ادیبوں کی سرپرستی حاصل رہی جنھوں نے ریاست میں رہ کر اُردُو کے فروغ میں بے پناہ کارنامے انجام دیے۔ اس شعبے سے ملک کے جو نامور ادیب وابستہ رہے اُن میں پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر آل احمد سرور، پروسفیر شکیل الرحمان شریف احمد، قدوس جاوید اور جعفر رضا کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کئی تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ عبدالقادر سروؔری کی کتاب ''کشمیر میں اُردُو'' ایسے ہی کارناموں میں سے ایک ہے۔ یوورسٹی کے اس شعبے نے اب تک ہزاروں کی تعداد میں طالب علم مستفید ہو چکے ہیں۔ یونی ورسٹی کے اس شعبے نے ریاست کو کئی اچھے افسانہ نگار، شاعر اور ادیب دیے۔ سینکڑوں موضوعات پر تحقیقی کام کروا کر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کیں۔ اس شعبے سے وابستہ بہت سے طالب علموں کے تحقیقی کارنامے کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے ریاست میں اُردُو کتابوں کا بڑا ذخیرہ بھی جمع ہو گیا ہے۔ یونی ورسٹی کے اس شعبے نے کئی توسیعی خطبات بھی منعقد کروائے اور ملک کے نامور ادیبوں کو سامعین کے روبرو کیا۔ جن موضوعات پر یونی ورسٹی نے تحقیقی کام کروائے ان میں بعض یہ ہیں:

1۔ اُردو نظم پر یورپی اثرات

2۔ سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے

3۔ اُردو اور کشمیری شاعری میں رومانیت

4۔ اُردو ناول میں کردار نِگاری

5۔ اُردو تنقید میں غالبؔ شناسی

6۔ اُردو تنقید میں اقبالؔ شناسی

7۔ اُردو شاعری میں میرؔ کی روایت

8۔ ۱۹ویں صدی کی اُردُو نثر میں سماجی طنز

9۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری

10۔ عصمت چغتائی کی شخصیت اور فن

11۔ کشمیری غزل پر اُردُو غزل کے اثرات

شعبۂ اُردو کشمیر یونی ورسٹی کے سالنامہ ''بازیافت'' نے بھی نہ صرف ریاست میں بل کہ پورے ملک میں اپنی شناخت بنا لی ہے۔ اس رسالے میں ریاست اور ریاست سے باہر کے نامور ادیبوں کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شعبے کی بزم بھی وقتاً فوقتاً مشاعروں اور سیمی ناروں کا اہتمام کر کے ریاست میں اُردُو کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ شعبے کے کئی اساتذہ کی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ریاست کے جو اساتذہ اس شعبے میں رہے اور جنھوں نے تحقیقی کارنامے انجام دیے اُن میں پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر زماں آزردہؔ، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر نذیر ملک اور ڈاکٹر مجید مظہر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شعبۂ اُردُو جمّوں یونی ورسٹی کا قیام ۱۹۶۵ء میں عمل میں لایا گیا۔ اُردُو کے نامور محقق پروفیسر گیان چند جین شعبے کے پہلے صدر مقرر کر دیے گئے۔ ابتدا میں یہ ایک چھوٹا سا شعبہ تھا لیکن آج اپنے کارناموں کی وجہ سے اس کا شُمار

ملک کے اہم ترین اُردُو شعبوں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے ذاتی دل چسپی لے کر ابتدا میں اُردُو پڑھنے کے لیے طلبہ کو متوجہ کیا۔ جب یہ شعبہ قائم ہوا تھا تو اس میں طلبا کی تعداد صرف دو تھی لیکن آج یہ تعداد سو سے زائد پہنچ چکی ہے۔

تحقیق و تنقید کے سلسلے میں بھی شعبے کے کارنامے سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل کے کئی قابلِ قدر مقالے لکھے گئے۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ شعبہ میں ڈگریوں کے علاوہ انفرادی کام بھی ہوئے۔ شعبہ اُردُو کے اساتذہ کی لکھی ہوئی کتابوں کو ملک میں بے حد سراہا گیا۔ بعض کتابوں کو ملک کی کئی اکیڈمیوں نے انعامات سے بھی نوازا۔ پروفیسر منظر اعظمی کا تحقیقی مقالہ ''اُردُو میں تمثیل نگاری اور سب رس کا تنقیدی جائزہ'' ملک کی بیشتر یونی ورسٹی کے اُردُو شعبوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر ظہور الدین کا تحقیقی مقالہ بیسویں صدی کے اُردُو ادب میں انگریزی کے رجحانات اور Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region، پروفیسر عابد پیشاوری کی کتاب ''انشا اللہ خان انشا''، ''انشا کے حریف و حلیف'' اور ''نقطے اور شوشے'' بھی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ شعبہ وقتاً فوقتاً مشاعروں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ شعبہ اب تک کل ہند اور ریاستی سطح کے کئی مشاعرے منعقد کروا چکا ہے۔ شعبۂ اُردُو جمّوں یونی ورسٹی کو عالمی سیمی نار منعقد کرانے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ''اُردو کی نئی بستیاں'' کے عنوان سے منعقد کیا گیا یہ عالمی سیمی نار اس لیے بھی خصوصیت کا حامل ہے کہ اس سیمی نار میں ملک کے نامور ادیبوں کے علاوہ جاپان کے پروفیسر ہیروشی کانا گایکا نے بھی حصّہ لیا۔ اس سیمی نار میں پوری دُنیا میں اُردُو کی صورتِ حال کے حوالے سے مقالات پیش کیے گئے، جو اب شعبہ کے ششماہی رسالے ''تسلسل'' میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ شعبہ ہر سال کسی نئے موضوع پر ملکی سطح کا سیمی نار بھی منعقد کرواتا ہے۔ اب تک جن موضوعات پر سیمینار ہو چکے ہیں، ان میں سے چند یوں ہیں:

ریاست میں اُردو، ماضی، حال اور مستقبل

اُردُو کا رِشتہ علاقائی زبانوں کے ساتھ

کل ہند اُردُو رائٹرس کانفرنس

ڈراما سیمی نار

تخلیقی ادب سیمی نار وغیرہ

شعبہ ہر سال ریاست کے بعض ممتاز ادیبوں کی یاد میں مشاعرے اور سیمی نار بھی منعقد کرتا ہے۔ شعبہ میں مرکزِ لغت کا قیام بھی عمل میں آ گیا ہے اور شعبے کے اساتذہ اُردُو کی ایک نئی لغت ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ ان ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جمّوں یونی ورسٹی کا شعبۂ اُردُو ممتاز اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ یہاں سال میں سو سے زیادہ ادبی تقاریب کا اہتمام ہوتا ہے جس کی وجہ سے ریاست میں اُردُو کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ پچھلے سال سے شعبے کا ششماہی رسالہ ''تسلسل'' بھی شائع ہونا شروع ہو گیا ہے جس میں تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

کسی بھی زبان کو فروغ دینے میں ذرایع ابلاغ کا خاصہ دخل ہوتا ہے۔ ریاست جمّوں و کشمیر میں بھی ریڈیو اور ٹی وی نے اس زبان کو بے حد شہرت بخشی۔

ریڈیو کشمیر سری نگر اور جموں

ریڈیو کشمیر سری نگر ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ ابتدا میں اس نے اُردُو زبان کے فروغ کے لیے نا قابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ ریڈیو جمّوں اور ریڈیو کشمیر کے زیرِ اہتمام کئی کل ہند مشاعرے منعقد ہوئے۔ ریڈیائی ڈرامے نشر کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ مختلف موضوعات پر تنقیدی مضامین نشر کیے گئے۔ محفلِ افسانہ بھی منعقد کی جانے لگی۔ ریاست کے دور دراز علاقوں کے شاعروں اور ادیبوں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقعہ ملا جس کی وجہ سے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے کارنامے منظرِ عام پر آئے۔ ریڈیو کشمیر جمّوں اور ریڈیو کشمیر سری نگر کو اُردُو کے نامور ادیبوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی جن میں راجندر سنگھ بیدی، پریم ناتھ در، ٹھاکور پونچھی، موہن لعل ایمہ، قیصر قلندر، غلام رسول نازکی، پران

کشور، علی محمد لون، جتیندر اودھمپوری، عبدالغنی شیخ، سوم ناتھ سادھو، زبیر رضوی، کے کے نیر اور میکش کاشمیری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران اِن ادیبوں نے ریاست میں اُردُو زبان وادب کو فروغ دینے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ ریاست میں ڈرامے کی صنف کو مقبول کرنے میں ریڈیو کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اب تک سینکڑوں ڈرامے جمّوں اور کشمیر سے نشر ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۳ء تک ریڈیو کشمیر جمّوں سے ''محفل'' پروگرام کے تحت قریباً چار سو ادبی پروگراموں کا انعقاد ہو چکا تھا۔ اب اس کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔

ریڈیو کے ساتھ ساتھ ٹی وی نے بھی اُردُو زبان کو فروغ دیا۔ کشمیر دُوردرشن کا قیام ۱۹۷۳ء میں عمل میں لایا گیا جب کہ جمّوں دُوردرشن کی نشریات ابھی چند سال پہلے ہی شروع ہوئی ہیں۔ دُوردرشن سری نگر سے کشمیری زبان کے بعد اُردُو کے پروگرام زیادہ نشر ہوتے ہیں جن میں خبریں، فیچر، ڈرامے، بحث ومباحثے وغیرہ شامل ہیں۔ ہر ماہ ''دھنک'' کے نام سے ماہنامہ اُردُو پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے جو خالص علمی وادبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے لیے ''نئے چراغ'' اور ریسرچ اسکالروں کے لیے ''عکس وآہنگ'' جیسے اُردُو کے پروگرام بڑے عرصے سے ٹیلی کاسٹ ہو رہے ہیں۔ اُردُو میں ڈرامے بھی نشر ہوتے رہے جو عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ دُوردرشن سری نگر کے اُردُو پروگراموں کے ناظرین کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ اس کے اسٹیشن ڈائریکٹر اُردُو کے اچھے ادیب رہے ہیں جن میں فاروق نازکی، فیاض شہریارؔ، اشرف ساحلؔ وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خود بھی ادیب ہیں اور ٹی وی سے وابستہ رہ کر انھوں نے ریاست میں اُردُو زبان وادب میں ذاتی دل چسپی لے کر بڑی خدمات انجام دیں۔ اِدھر دُوردرشن جمّوں سے بھی اُردُو کا خالص ادبی پروگرام ''آبشار'' ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ریاست کے اُردُو ادیبوں کے انٹرویوز کے علاوہ غزلوں کے پروگرام کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہنا بجا ہوگا کہ ریڈیو اور ٹی وی نے اُردُو کی تشہیر میں اہم کردار ادا کیا اور یونی ورسٹی کے شعبوں میں ہونے والی تحقیق اور تنقید نے ریاست کے ادبی معیار کو بلند کیا۔

ASSIGNMENT QUESTIONS:

نوٹ: مندرجہ ذیل تین سوالات میں سے کوئی دو سوالات کے جوابات لکھئے۔

1۔ جموں وکشمیر میں اُردو زبان کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی کیجئے۔

2۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالئے۔

3۔ جموں وکشمیر میں اردو نثر کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

Content Editing: Dr. Liaqat Ali

Inch. Teacher Urdu. DDE, University of Jammu. (Unit-I to IV)

© Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu 2019

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the DDE, University of Jammu.

* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the DDE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By :

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF INSTRUCTION MATERIAL
M.A. URDU (SEMESTER FIRST)

COURSE NO: 105 (DEVELOPMENT OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE IN JAMMU AND KASHMIR)

UNIT I-IV **LESSON : 1-16**

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK COORDINATOR P.G. URDU, DDE.

DR. LIAQAT ALI INCH. TEACHER URDU, DDE

http:/www.distanceeducationju.in

(C) All copyright privileges of the material vest with the Directorate of

Distance Education, University of Jammu, Jammu-180006